چنار کے
برفیلے سائے
(افسانوی مجموعہ)
اکٹر نیلوفر ناز نحوی قادری

چنار کے برفیلے سائے

چنار کے برفیلے سائے

(افسانوی مجموعہ)

ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی قادری

chinar key barfeeley sayey

price Rs.300/-

ISBN :978-81-924010-1-0

کتاب کا نام	''چنار کے برفیلے سائے''
مصنفہ	ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی قادری
کمپیوٹر کمپوزنگ	قادری کمپیوٹرس
سرِ ورق	حارث احمد قادری
اشاعت	۲۰۱۳ء
قیمت فی جلد	۳۰۰/روپئے
طباعت	الحیات پرنٹوگرافرس سری نگر 9419525103#

انتساب

اپنے اس ساتھی کے نام

جو ہمیشہ، ہر وقت،

میرے دکھ میں، میرے سکھ میں

شامل ہے۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خون چکان
ہرچند اسمیں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

(مرزا غالبؔ)

فہرست مضامین

☆☆☆

حرف اول

ڈاکٹر نیلوفر ناز قادری نئی ادبی نسل کی ایک منفرد اور تخلیقی افسانہ نگار ہے۔ان کے افسانے زیادہ تر موجودہ مابعد جدیدیت کے دور میں لکھے گئے ہیں جو اس دور کے لکھے جانے والے افسانہ نگاروں میں حقیقت اور فرضیت کے امتزاجی عمل کی نمائندگی کرتے ہیں سن ۱۹۸۰ء کے بعد اردو ادب میں مابعد جدیدیت کی صورت حال نظر آتی ہے۔اسکی رو سے نئے افسانہ نگار کسی پہلے سے طے کردہ یا منضبط نظریے کی پابندی کرنے سے گریزاں نظر آتے ہیں۔یورپی ادب میں ٹی ایس ایلیٹ کے زمانے سے دوسری جنگ عظیم تک جدیدیت کا غلغلہ رہا۔

اردو میں سنہ ۱۹۶۰ء کے بعد ترقی پسندی کے ردعمل کے طور پر جدیدیت کا چرچا ہونے لگا۔اسکی رو سے مکینکی اور سائنسی ترقیات کے نتیجے میں اقدار شکنی، بے یقینیت اور ذہنی اور نفسیاتی conflicts کی طرف توجہ دی گئی۔اسکے علاوہ یعنی مارکسزم کے بعد حیئتی تنقید کے کئی نمونے سامنے آئے سنہ ۱۹۸۰ء کے بعد اردو میں مابعد جدیدیت کی نشاندہی ممکن ہوئی

ہے۔نیلوفرناز مابعد جدیدیت کے عہد کی نمایندگی کرتی ہیں۔وہ مقامی اور غیر مقامی سطحوں پر سیاسیات کی چنگیزیت،معاشرتی گھٹن اور اقتصادی درہمی کا قریب سے مطالعہ کرتی ہیں۔ایسا کرتے ہوئے انہوں نے اپنے لئے ایک الگ راستہ چُن لیا ہے۔وہ زیادہ تر مقامی سطح پر گھریلو disintegration جو پرانی اور نئی نسلوں کے درمیان واقع ہوتا ہے پر توجہ مرکوز کرتی ہے اور قاری کو درد اور کرب سے متصادم کراتی ہے۔اس طرح سے مقامی کلچر کے پس منظر میں واقع ہونے والے واقعات و حالات کو افسانوی صورت عطا کرتی ہے۔

نیلوفرناز کے افسانوں کا اسلوب لسانی برجستگی اور حقیقت کو خواب میں بدلنے کا جو انداز ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔انکی افسانہ نگاری کی یہ خوبی بھی نمایاں ہے کہ وہ کرشن چندرانہ طول وطویل تمہید و بیان سے اعتراض کرتی ہے۔اختصار پسندی ان کے افسانوں کی پہچان ہے۔ایک چھوٹا سا گھریلو واقعہ سامنے آتا ہے اور قاری اس کے اثر واقتدار سے متاثر ہوتا ہے۔ان کے افسانوں کا تمہیدی جملہ اور پھر اس کا خاتمہ تلازمات (sugestivty) کا غماز ہے۔مجھے خوشی ہے کہ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''چنار کے برفیلے سائے'' شائع ہو رہا ہے جو قارئین کی پذیرائی کا منتظر ہے۔

پروفیسر حامدی کاشمیری

(۲۳/اپریل ۲۰۱۳ء)

پیش گفتار

یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں خواتین افسانہ نگاروں نے اپنی افسانوی تخلیقات سے صنف افسانہ کو ہر دور میں روشن رکھا۔لیکن اس بات سے انکار کی گنجائش نہیں کہ ان میں سے اکثر خواتین افسانہ نگاروں نے اب مکمل طور پر خاموشی اختیار کر لی ہے۔اس کے باوجود آج کے دن بھی ہمارے درمیان چند ایسی خواتین افسانہ نگار موجود ہیں جو اپنے افسانوں کو حسن وادا سے سنوارنے اور سجانے اور ان افسانوں کے کرداروں کو فکر وفن کے بہتر سے بہتر لباس میں پیش کرنے کا ہنر بخوبی جانتی ہیں۔ان خواتین افسانہ نگاروں میں ترنم ریاض،نعیمہ احمد مہجور،نسرین نقاش،سیدہ نکہت فاروق اور زنفر کھوکھر کے نام لیتے ہوئے مجھے مسرت ہو رہی ہے۔ان کی سوچوں میں گہرائی ہے،فکر میں بلندی ہے،افسانوی فن کے مختلف زاویوں سے آشنائی ہے،سماج پر طنز کرنے کی ہمت

ہے اور سچائیوں کے پس منظر میں تلخیوں کو ابھارنے کا جذبہ موجود ہے۔ مجموعی طور پر ان خواتین افسانہ نگاروں کی تعداد کم ہے لیکن جہاں تک تخلیقی معیار کا تعلق ہے یہ معیار ملکی سطح پر بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ آج اس چھوٹے سے قافلے میں ایک اور خاتون افسانہ نگار شامل ہو رہی ہیں۔ اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی قادری کے افسانے پڑھ کر آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔

''چنار کے برفیلے سائے'' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اور اس میں (۲۹) کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔

ایک قلمکار روایت پسند ہو یا ترقی پسند، جدیدیت میں یقین رکھتا ہو یا مابعد جدیدیت کی زلفوں کا اسیر ہو، لیکن اس کے قلم کی چنگاری ہی اسے ادب کی مشعل روشن کرنے میں مدد کر سکتی ہے۔ یہ چنگاری اگر بجھ گئی تو نئی ادبی اور علمی راہیں تلاش کرنے میں مشکلات آسکتی ہیں۔ آپ اس بات سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن میرا ماننا ہے کہ افسانہ اردو ادب کی ایک مشکل صنف ہے۔ یہ ایک ایسی صنف ہے جس کا اختصار ہی اس کی کامیابی میں پوشیدہ ہے لیکن اس اختصار کے باوجود افسانہ کا مدعا اور مقصد ہر حالت میں واضح ہونا چاہئے۔

ڈاکٹر نیلوفر ناز کے اکثر افسانوں میں جہاں سماجی ناہمواریوں کا ذکر ملتا ہے وہیں سماج اور معاشرے کو اخلاقی گراوٹ سے بچانے کی تدابیر بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ افسانہ ''ایک دن کی حکومت'' سے ایک اقتباس۔۔۔!

''میرا قانون یہ ہوگا کہ کنواری لڑکیوں کو نوکری نہیں ملے گی۔۔۔سب نوکریاں لڑکوں کو ملیں گی، کنواری لڑکیوں کی شادی ہو جائے گی۔لڑکیوں کو نوکری کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی لڑکیوں کو نوکری کے لئے دربدر بھٹکنا پڑے گا۔وہ اپنا گھر آرام سے بسائیں گی اور پھر شادی کے بعد یہ شوہر کی پریشانی ہوگی کہ وہ اپنی بیوی سے نوکری کرائے گا یا نہیں، اوراسطرح نہ لڑکے نوکری کے لئے پریشان رہیں گے اور نہ لڑکیاں کنواری رہیں گی۔''

متنوع موضوعات کا انتخاب اور پُر اسلوب انداز بیان ڈاکٹر نحوی صاحبہ کے افسانوں کو ایک جداگانہ انداز عطا کرتا ہے۔دوسری اہم بات جو ان کے افسانوں میں دیکھی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ ان میں غیر ضروری واقعات کی بھرمار دیکھنے میں نہیں آتی ہے اور نہ ہی ان کے کردار غیر ضروری باتیں کرتیں ہیں۔'نازلی' ان کا ایک افسانہ ہے بغیر کسی تمہید یا وضاحت کے وہ اس میں ان دیکھی محبت کی کہانی کو سادگی کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔نفرت کو محبت میں بدلنے کے لئے ایک لمحہ بھی درکار نہیں ہوتا۔اس کہانی کی روح اس کے اختتام میں پوشیدہ ہے۔یہ نازلی کے شبرِ دل کی کہانی بیان کرتا ہے۔

''سنیئے،آپ فکر مت کیجئے۔ ہم آپ کو ہاسپٹل
پہونچائیں گے۔۔۔پلیز ہوش میں آجایئے ۔۔۔
آپ کے بغیر۔۔۔میں ۔۔۔نہیں ۔۔رہ ۔۔
پاؤں گی۔''   افسانہ'نازلی'

ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی قادری کے افسانے واقعی دل کے دروازے پر دستک دیتے ہیں اور ذہن کو کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں، اور جب یہ سوچیں آنکھوں میں سمٹ جاتی ہیں تو ایک

تصویر میں بدل جاتی ہیں اور پھر اس تصویر میں رنگ بھر کر ہم ان سچائیوں کو دیکھتے ہیں جنہیں عام طور پر ہم نظر انداز کرتے ہیں۔آشیانہ ایک بوڑھے والد کے اکیلے پن کی کہانی ہے۔سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ بیٹا اس کے گھر میں رہتا ہے بیوی بچوں کے ساتھ مگر بوڑھے والد کی درد کی لکیریں اکیلے پن کے ناسور سے گہری ہو چکی ہیں۔ایک جھلک دیکھئے۔۔۔۔۔!

ارے بیٹی نہیں۔مجھے کون کچھ کہے گا۔تیری ماں جب تک زندہ تھی۔تب میں بھی زندہ تھا۔کتنے سکھ بھرے دن تھے۔کس قدر خوشحالی تھی۔مگر وہ جنتی تو میری دنیا اجاڑ کر گئی ہے۔میری زندگی میں زندگی جیسا لفظ ہی گُم ہو گیا ہے۔میں زندہ تو ہوں مگر جینا کس کو کہتے ہیں یہ آج مجھے معلوم نہیں۔میں آج بچوں پر ایک بوجھ بن گیا ہوں،موت میرے بس میں نہیں ورنہ میں آج ہی اس دنیا کو چھوڑ کر جاتا۔میرے بچے بھی آرام کرتے اور اس بوڑھے کے بوجھ سے چھٹکارا پاتے۔‘‘

ڈاکٹر نجوی کو فارسی زبان پر عبور حاصل ہے۔وہ فارسی پڑھاتی ہیں۔فارسی زبان کی اپنی ایک اعلیٰ قدر ومنزلت ہے۔اس کا دامن وسیع ہے۔فارسی کا افسانوی ادب زرخیز ہے۔مجھے اس بات کا احساس ’’کوچہ عشق‘‘ پڑھ کر ہوا۔اس میں فارسی زبان میں تحریر کردہ خواتین افسانہ نگاروں کی سولہ کہانیوں کا ترجمہ شامل کیا گیا ہے۔انتخاب اور ترجمہ کی ذمہ داری آذر میدُخت صفوی نے سنبھالی ہے۔وہ لکھتی ہیں گذشتہ تیس برسوں کے دوران

افسانہ لکھنے والوں نے نئے تجربات کئے اور بہت سی معنی خیز جہات کو فارسی افسانے میں شامل کیا۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ اپنی ریاست میں فارسی شیدائیوں کی تعداد محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ فارسی پڑھنے والے طالب علم اب قلیل تعداد میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نظر آتے ہیں۔ البتہ یہ بات قابل ستائش ہے کہ ڈاکٹر نحوی نے اردو کی کئی کہانیوں کا فارسی میں ترجمہ کر کے ایک اہم کام انجام دیا ہے۔ اور اس طرح کشمیر سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں کو فارسی کے افسانوی ادب میں متعارف کرانے میں پہل کی۔ ان افسانہ نگاروں میں مرحوم عمر مجید سرفہرست ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نحوی صاحبہ کی چند کہانیوں میں فارسی زبان کی چاشنی ملتی ہے، جو ذہن و دل کو تازگی عطا کرتی ہے۔

کشمیر کے پُر آشوب دور کے تعلق سے بھی ڈاکٹر نیلوفر ناز نے غم و درد کی تیز لہروں کے درمیان افسانے قلمبند کئے ہیں۔ ان افسانوں میں انہوں نے سچائی کو سچائی کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔ اس سچائی میں جھانکنے سے بہت ساری باتیں عیاں ہوتی ہیں۔ بہت سارے نقاب اُلٹ جاتے ہیں، عوامی تشنگی کا احساس ابھرتا ہے۔ مجموعے میں شامل کہانی ''برتھ ڈے'' ایک بیٹے اور چار بیٹیوں کی کہانی ہے۔ جب بیٹا پیدا ہو جاتا ہے تو سارے گھر میں خوشیاں بکھر جاتی ہیں۔ اور جب بیٹا نو سال کا ہو جاتا ہے تو برتھ ڈے کیک کاٹنے سے پہلے اپنے دوست سے ملنے چلا جاتا ہے اسی دوران گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں تو بہت سارے لوگ سڑک پر نکل آتے ہیں۔ اور دیکھتے ہیں کہ چار بہنوں کا لاڈلا بھائی خون میں لت پت ایک عورت کی بانہوں میں آخری سانسیں لے رہا ہے----

''زہرہ نے دسویں پاس کیا تھااور وہ گیارویں کا فارم بھر چکی تھی۔شاذیہ
ساتویں اور اسکے بعد شافیہ پانچویں میں پڑھتی تھی۔ان سب کی لاڈلی
بہن چھوٹی سی روبی جو تیسری کلاس میں پڑھتی تھی۔وہ اپنی ننھی ننھی اور
پیاری پیاری باتوں سے سب کا من بہلاتی تھی۔۔۔مگران کے ممی پاپا کو
ایک بیٹے کا انتظار تھا۔۔۔۔اے اللہ اب کی بار مجھے بیٹا دینا''۔!!

کشمیر کی خوبصورتی ،سندرتا اور سحر انگیز فضاؤں سے ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی کو والہانہ پیار ہے۔یہاں کے رنگ بدلتے موسم انہیں پسند ہیں۔چنار اور برف تو ان کی کمزوری ہے۔لگتا ہے کہ ان کی رومانیت کا دائرہ چنار کے پتوں سے چھوتا ہوا سپید سپید برف میں تحلیل ہو کر ان کی سوچوں کو ایک نئے راستے سے آشنا کرتا ہے اور اس راستے پر چلتے چلتے انہیں نئی کہانیاں ملتی ہیں ۔ اپنی کہانیاں، اپنے آس پاس کی کہانیاں، اپنے کشمیر کی کہانیاں۔۔۔۔!

''دوسری صبح سکینہ کی لاش ،سڑک کے دوسرے کنارے
پڑی ہوئی تھی۔اور اس کا جسم جگہ جگہ لہولہان تھا۔سورج
اُگنے سے پہلے ہی ڈوب چکا تھا۔۔۔''

(افسانہ۔۔۔قہر)

سکینہ دراصل کشمیر کا ایک روپ ہے،ڈاکٹر نحوی نے سکینہ کو علامت کے طور استعمال کیا ہے اور کشمیر کے پُرآشوب اور لہولہان دور کو سکینہ کی لاش میں سمیٹ لیا ہے۔۔۔!

جہاں ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی قادری کے افسانے دلچسپ اور دلنشین ہیں وہیں یہ افسانے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں یا یوں کہیئے ان کی شگفتگی،نفاست،سادگی اور

شرافت کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔!!!

مجھے قوی امید ہے کہ موصوفہ اگر اپنے تخلیقی سفر کو اسی طرح جاری رکھیں گی تو مستقبل قریب میں ہمیں ان سے بہتر افسانے پڑھنے کو ملیں گے۔

نور شاہ

سرینگر۔۔۔۲۰ فروری ۲۰۱۳ء

پیش لفظ

ای گُل بہ تو خرسندم تو بوی کسی داری

(سعدی)

افسانے پڑھنے کا شوق مجھے بچپن سے تھا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ افسانہ ہی ایک ایسی صنف سخن ہے جو انسان کے درد و غم اور خوشی و انبساط کی عکاسی کرسکتا ہے۔ آہستہ آستہ افسانہ لکھنے کی طرف رغبت ہوگئی۔ مگر افسانہ لکھنے کا میرے درون کے اندر ایک خوف سا تھا۔ حالانکہ میں نے پہلا افسانہ میٹرک کے امتحان کے بعد ہی لکھا۔ اور اس کا نام ''جوان بوڑھا'' رکھا۔ نام سے اسکے مواد کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ایک ڈر اور خوف میں نے دل کے کسی گوشے میں پال رکھا تھا۔ افسانہ ''جوان بوڑھا'' جانے کس ڈائری پر لکھا گیا ہے اور کس طاق نسیان پر رہ گیا ہے آج میرے ہاتھ نہیں آتا ہے۔ ہمارے سامنے کتنے ہی بڈھے

ایسے ہیں جو ابھی تک جوان ہی ہیں اور بوڑھا ہونے کا نام ہی نہیں لیتے ہیں۔ جو سماج کی بہنوں اور بیٹیوں کو جینے نہیں دیتے ہیں۔شاید اسی نے میرے قلم کو زبان دے دی۔

گرد و نواح کے حالات ہی شاید کسی مصنف اور شاعر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسکی صحیح ترجمانی ناول یا افسانہ ہے۔افسانوی مجموعہ سے پہلے میری چار اشاعتیں منظر عام پر آئیں ہیں۔مگر مجھے جس کتاب کے چھپنے کی از حد آرزو ہے وہ افسانے ہیں۔۔۔۔اللہ سبحان وتعالیٰ کا بے حد شکر گذار ہوں کہ آج میری وہ تمنا پوری ہوگئی کہ میرا افسانوی مجموعہ ''چنار کے برفیلے سائے'' منظر عام پر آرہا ہے۔

میں اپنے والدین کی ہمہ وقت مشکور ہوں اور ان کے لئے ہمیشہ دعا گو ہوں۔ میری والدہ ماجدہ کو اللہ تعالیٰ جنت الفردوس عطا کرے اور والد محترم کو زندگی اور صحت وتندرستی عطا کرے۔(آمین) انہیں کی کاوشوں اور محنتوں کا نتیجہ ہے کہ آج میں اس مقام پر کھڑی ہوں۔

میں اپنے شوہر کی کامیابی اور کامرانی کے لئے ہمیشہ دعا گو ہوں۔ان کے تعاون کے بغیر میری ہر کوشش ادھوری ہے۔

حارث احمد کا شکریہ کرنا بھی لازم ہے۔کیونکہ انہوں نے ہمیشہ میری کتابوں کا سرورق تیار کیا۔اس کتاب کا سرورق بھی انہی کی محنت کا نتیجہ ہے۔

میں ڈاکٹر حامدی کشمیری کی بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے اس عمر میں اپنی کمزوری اور ناتوانی کے باوجود بھی مجھے اتنا وقت دیا کہ میرے افسانوں کو پڑھا

اور میری حوصلہ افزائی کی۔اس میں شک نہیں کہ دوسال سے ان افسانوں کو چھاپنے کا سلسلہ چل رہا ہے۔مگر اللہ کا شکر ہے کہ اب آخری مرحلے میں پہونچ چکے ہیں۔

میں نورؔ شاہ صاحب کی بے حد مشکور ہوں جنہوں نے میرے چند افسانے پڑھ کران پر اپنی آرا ظاہر کی۔اور میری حوصلہ افزائی کی۔

میں اپنے قلم کو زبان دینے میں کہاں تک کامیاب ہوئی ہوں اسکے منصف قارئین سے بڑھکر اور کوئی نہیں۔امید کرتی ہوں کہ قارئین اپنے آرا سے ناچیز کو نوازیں گے اور میری حوصلہ افزائی کریں گے۔

ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی

۶۲۔گوگجی باغ،

نزدیک پولی ٹیکنک کالج

سرینگر کشمیر

ای میل:naaz_neelofer@yahoo.com

موبائل:9906570372

☆☆☆

(۱) تم نہیں اور سہی

''جی آپ اردو کے نئے پروفیسر ہیں؟''تسلیمہ نے بات شروع کرنے کے لئے کہا۔

''جی، جی۔۔ میں یہاں نیا آیا ہوں، ٹرانسفر ہو کر۔سلیم گنائی۔''

''جی میں ڈاکٹر تسلیمہ۔اینورنمنٹ سائنس میں ہوں''۔

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی''۔

''اس سے پہلے آپ کہاں تھے؟''

''میں اس سے پہلے گرلز کالج، سوپور میں تھا۔''

''چلئے۔۔ مجھے تو اردو نہیں آتی ہے، میں اب آپ سے ہی سیکھوں گی۔''

''جی۔۔جی۔۔ضرور''

''مجھے کبھی کبھی غالب یا اقبال کے شعر کو سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔میں ان دونوں کو پڑھتی ہوں۔میں کبھی کبھار لکھتی بھی ہوں۔اور ان دونوں کو کورٹ کرتی ہوں۔شاید مجھے کبھی کبھی

آپ کی help چاہئے۔''

''جی آپ حکم کیجئے، بندہ حاضر ہوگا''۔ پروفیسر سلیم گنائی نے بڑے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

پروفیسر تسلیمہ کو اس کالج میں دس سال ہو چکے تھے۔ وہ بہت خوبصورت تھی اور آنکھیں اس کی بڑی بڑی تھیں۔ اسے مردوں کے ساتھ باتیں کرنے میں مزہ آتا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ عورتیں جب آپس میں ملتی ہیں تو gossip کرتی ہیں اور مردوں کے ساتھ جب ملتے ہیں تو ادب اور لٹریچر کی باتیں ہوتی ہیں۔ اس کو ادب کے ساتھ کافی دلچسپی تھی۔ اس کی شادی ابھی نہیں ہوئی تھی۔ جبکہ اب تقریباً چالیس کی ہونے کو آئی تھی۔ اس کے گھر والوں کو کوئی ایسا لڑکا نہیں ملتا تھا جو ان کو تسلیمہ کے لائق لگتا۔

دوسرے دن پروفیسر تسلیمہ کالج کے لان میں چل رہی تھی کہ ان کی نظر پروفیسر گنائی پر پڑی۔

''گنائی صاحب کیا بات ہے۔ آپ تو ہم سے دور دور بھاگتے ہیں''۔

''نہیں نہیں، پروفیسر صاحبہ ایسی بات نہیں ہے۔۔۔ دراصل مجھے لیڈیز کے ساتھ بات کرنے میں۔۔۔ ذرا سی۔۔۔۔۔'' انہوں نے ابھی اپنا جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ پروفیسر تسلیمہ بول پڑی۔

''نہیں گنائی صاحب۔۔ میں اس ٹائپ کی لڑکی نہیں ہوں۔ میں تو ان معاملات میں بہت straight forward ہوں۔۔۔ اور پھر کالج میں تو چلتا ہی رہتا ہے۔''

''جی''

''ذرا سنایئے کچھ۔۔۔ کوئی شعر۔۔ غالب کا اقبال کا۔۔ یا کچھ اپنا ہی کلام سنایئے۔۔ آپ بھی تو لکھتے ہونگے۔''

’’جی ۔۔لکھتا تو ہوں کبھی کبھی۔۔۔کچھ خاص نہیں۔۔۔بس یونہی۔۔۔قلم زنی کرتا ہوں۔۔‘‘

’’واہ۔۔یہی تو شاعرانہ انداز ہیں۔شاعری کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قلم زنی کرتا ہوں۔‘‘

اس پر دونوں ہنس پڑے۔پروفیسر گنائی جوان تھا اور خوبرو بھی۔اس کی ہنسی بہت پیاری تھی۔پروفیسر تسلیمہ اس کو دیکھتی ہی رہ گئی۔

پروفیسر گنائی بھی اس کو دیکھ رہا تھا۔اور اچانک اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

پروفیسر تسلیمہ کلاس سے باہر نکل رہی تھی تو گنائی صاحب پر ان کی نظر پڑی جو کسی سٹوڈنٹ کے ساتھ کسی بات پر بحث کر رہے تھے۔تسلیمہ کلاس سے نکل کر ان کے پاس آئی اور کہنے لگی۔

’’گنائی صاحب کیا ہو رہا ہے۔۔کس بات پر گرم گفتگو ہو رہی ہے؟۔اس گفتگو میں ہمیں بھی شامل کیجئے‘‘۔

’’جی بس کچھ خاص نہیں۔۔یہ سٹوڈنٹ کسی شعر کی وضاحت چاہ رہا تھا۔‘‘

’’پروفیسر صاحب شعر ہمیں بھی سنایئے۔‘‘

’’دل کو خیال یار نے مخمور کر دیا ساغر کو رنگ بادہ نے پُرنور کر دیا‘‘

ارے واہ واہ۔شعر تو بہت خوبصورت ہے۔۔بہت ہی خوبصورت۔یہ شعر کس کا ہے‘‘؟

’’یہ شعر فیض کا ہے۔‘‘

’’بہت خوبصورت۔۔‘‘پروفیسر تسلیمہ نے شعر کی تعریف کرتے ہوئے پروفیسر گنائی کی آنکھوں میں دیکھا۔اور پروفیسر نے بھی اس کی نگاہوں میں جھانکا اور دونوں ایک

دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔

دونوں نے نظریں جھکالیں۔

اب کالج میں اکثر و بیشتر ان کا سامنا ہوتا تھا۔کبھی آتے وقت اور کبھی جاتے وقت۔کبھی دن میں اور کبھی کلاس میں جاتے یا کلاس سے نکلتے وقت۔

تسلیمہ کے دل میں تھوڑی سی بے قراری بڑھنے لگی۔ایک دن پروفیسر گنائی نکلتے وقت گاڑی نکال رہے تھے تو پروفیسر تسلیمہ نے روک کر کہا۔

''آپ کس طرف جارہے ہیں۔اگر آپ بُرا نہ مانیں تو مجھے لفٹ چاہیئے۔''

''آیئے آیئے my pleasure۔۔میں برانہیں مانوں گا۔۔'' کار کا آگے کا دروازہ کھولتے ہوئے پروفیسر گنائی نے کہا۔

کار میں بیٹھتے ہوئے پروفیسر تسلیمہ نے کہا۔''پروفیسر صاحب مجھے آپ کو پروفیسر گنائی کہتے ہوئے کچھ عجیب سا لگتا ہے۔آپ کا نام کیا ہے میں آپ کو نام سے پکاروں گی۔''

''سلیم گنائی'' پروفیسر گنائی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اگر میں آپ کو سلیم کے نام سے پکاروں، آپ کو بُرا تو نہیں لگے گا۔۔۔۔''

''جی نہیں آپ تو تب بھی میرے نام سے ہی پکاریں گے۔۔''

''ٹھیک ہے سلیم صاحب۔۔۔۔بہت خوبصورت نام ہے۔۔''

''کس طرف جائیں گی آپ۔۔۔؟''

''جس طرف آپ لے جائیں گے۔۔۔میرا مطلب ہے جس طرف آپ جائیں گے ۔۔میں راستے میں کہیں اتر جاؤں گی۔۔۔۔''

''جی۔۔۔جی۔۔۔۔جی۔۔'' پروفیسر گنائی نے نظریں جھکائیں۔

اب اس کے منہ میں جیسے زبان نہیں ہے۔وہ بس گاڑی چلا رہا تھا۔جیسے اب بات کرنے سے ڈرر ہا تھا۔دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔

''یہ تسلیمہ جی کس قدر بے تکلف ہیں۔۔۔انہیں تو کسی بات سے ڈر ہی نہیں لگتا ہے۔۔۔مجھے تو خوف سا لگتا ہے۔۔۔لوگ کیا کہیں گے۔۔گرلز کالج میں تو ایسی humilation کبھی نہیں ہوئی تھی۔''

''آگے دوراہا ہے گاڑی کس طرف لے جاؤں''

''کہیں بھی لے جایئے۔اپنے گھر یا میرے گھر۔۔۔سلیم صاحب میں مذاق کر رہی ہوں۔تھینک یو۔بس یہیں روک دیجئے۔

پروفیسر نے گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کر دی مگر منہ سے ایک لفظ بھی نہیں بول سکے۔ تسلیمہ جی گاڑی سے اتری،تو سلیم نے اپنے آپ سے کہا۔

''لڑکی تو اچھی ہے۔کاش اسکے ساتھ میری دوستی بڑھتی رہے۔''

دوسرے دن پھر پروفیسر تسلیمہ پروفیسر گنائی کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔اور پھر اسی دوراہے پر پہونچ کر سلیم نے گاڑی روک دی۔''سلیم صاحب آج آپ میرے ساتھ میرے گھر تشریف لے آیئے۔ایک چائے کی پیالی ہو جائے۔''

''نہیں پھر کبھی۔۔۔''سلیم نے منع کیا۔

''آیئے نا پلیز۔۔۔۔پلیز''

گنائی صاحب نے بھی زیادہ تانا شاہی نہیں دکھائی۔اسکے من ہی من میں لڈو پھوٹے۔

''اوکے'' کہہ کے گاڑی ایک سائڈ میں پارک کی اور اس کے ساتھ ہو لیا۔

دونوں تسلیمہ کے گھر پہونچ گئے۔پروفیسر تسلیمہ نے گھر کی گھنٹی بجائی اور تھوڑی دیر کے بعد

اندر سے کسی نے دروازہ کھول دیا۔سلیم صاحب کی نظریں اٹھیں ۔۔اور پلک جھپکنا بھول گئے۔۔۔

سامنے sky blue رنگ کی ساڑھی میں ملبوس ایک خوبصورت لڑکی کھڑی تھی۔جس نے ہاف سلیوز بلوز پہنا تھا اور جس کا گلا بہت کھلا کھلا تھا۔بال بھی شانوں پر آدھے سے زیادہ بکھرے تھے۔اورآدھے بالوں کوایک چھوٹی سی کلپ سے بند کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

''یہ میری چھوٹی بہن ہے۔ڈاکٹر سائیرہ''

پروفیسر گنائی نے تحسین کی ایک نگاہ اس پر ڈالی اور کہا۔''اسلام وعلیکم،آپ خیریت سے ہیں۔''

''سلام وعلیکم،جی بالکل۔۔۔آپ پروفیسر سلیم ہی ہونگے۔۔''

''جی۔۔۔جی ہاں۔۔مگر آپ۔۔؟''

''باجی تو آپ کی باتیں کرتے تھکتی نہیں۔۔۔اورآپ اسی لائق ہیں بھی۔۔''

''کس لائق؟''

''کہ آپ کی باتیں کوئی کرے۔۔''

''شکریہ۔۔۔دونوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''پروفیسر تسلیمہ اتنے میں چائے بنا کے لائی۔ان کو ہنستے دیکھ وہ بھی ہنس پڑی۔اس نے آج پہلی بار سلیم صاحب کو کھل کر ہنستے ہوئے دیکھا۔اس کے دل میں گدگدی ہوئی۔

وہ چائے انڈیلنے لگی۔اور پروفیسر گنائی ڈاکٹر سائرہ کے ساتھ باتوں میں مشغول ہوگئے۔

''آپ تو بڑے دلچسپ آدمی ہیں''۔

''آپ کی ہنسی تو بہت ہی پیاری ہے''۔

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے ان کی نظریں کئی بار ٹکرائیں۔

پیالی نیچے رکھتے ہوئے سلیم صاحب نے اجازت طلب کی تو سائیرہ نے کہا۔

''پروفیسر صاحب اب کب ملاقات ہوگی۔''؟

پھر رُک کر دوبارہ بولی۔۔''جب بھی آپ کا دل کرے بلا جھجک آجایئے گا''۔اور ایک میٹھی سی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر چھوڑ گئی۔

گھر جا کر پروفیسر گنائی کو ایک عجیب سی بے کلی محسوس ہوئی۔بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے نیلی ساڑھی میں ملبوس سائیرہ کا کھلکھلاتا ہوا چہرہ آرہا تھا۔اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پھر سے اس سے ملے۔مگر کوئی بہانہ تو چاہئے۔

چھٹی کے وقت وہ پروفیسر تسلیمہ کا انتظار کر رہا تھا۔گاڑی کے سامنے تسلیمہ جی آکر رُک گئی اور کہا۔''سلیم صاحب آپ جایئے۔میں آج کسی اور طرف جارہی ہوں۔ انتظار کرنے کا شکریہ۔''

''اوکے'' کہہ کر اس نے گاڑی آگے بڑھادی۔

دوراہے پر پہونچ کر اس کا پاؤں خود بخود بریک پر پڑ گیا۔اور گاڑی رُک گئی۔وہ گاڑی سے اترا اور اس کے قدم آہستہ آہستہ جیسے بے خیالی میں تسلیمہ جی کے مکان کی طرف اٹھ رہے تھے۔اس نے دروازے پر bell بجائی۔

دروازہ کھل گیا۔گلابی سوٹ پر سفید کڑھائی اور سفید رنگ کا ڈوپٹہ گردن میں لٹک رہا تھا اور غضب ڈھا رہا تھا۔

''ڈاکٹر سائیرہ۔۔۔۔ہ۔۔ہ

ڈاکٹر سائیرہ کی تو صرف آنکھیں ہی کھلی رہ گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔

''پروفیسر صاحب باجی تو ابھی آئی نہیں ہے۔ انہیں کسی کام سے کہیں جانا تھا۔''

''جی میں جانتا ہوں۔۔۔ میں۔۔ میں۔۔۔ اسی لئے۔۔۔۔''

نظریں جھکا کے ''جی۔۔۔ وہ۔۔۔''

سائیرہ نے نظریں اٹھائیں جیسے اس کے پورے جملے کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔ صرف ایک مسکراہٹ پر کام چلا لیا۔

سائیرہ نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا اور انہیں اندر لے گئی۔ باتوں باتوں میں اس کو اپنے بچپن میں لے گئی اور اس کو اپنی ساری تصویریں بھی دکھائی۔

''میں بچپن میں بہت تیز تھی۔''

''آج بھی تو ماشاللہ کچھ کم نہیں۔۔'' اسی کے ساتھ اسنے اجازت طلب کی۔

''اسے پہلے کہ تمہاری بہن آجائے۔ مجھے چلنا چاہئے۔''

''چلئے انشااللہ پھر ملاقات ہوگی۔''

سلیم صاحب 'خدا حافظ' کہہ کر چلے گئے مگر سائیرہ ایک عجیب کشمکش میں پڑ گئی۔ بہن کے آنے سے پہلے کیوں جانا چاہتے تھے۔

☆

''باجی آج تمہارے پروفیسر صاحب پھر آئے تھے۔''

''کب؟ کیوں؟ کیسے؟''

''وہ شاید آج مجھ سے ملنے آئے تھے۔۔۔۔ شاید انہیں۔۔۔۔ وہ۔۔۔ شاید۔۔ میں'' وہ ہڑبڑا رہی تھی مگر کوئی جملہ اس سے نہیں بن رہا تھا۔

"کیا تمہیں بھی وہ پسند ہیں۔۔۔سچ بتاؤ۔۔۔" باجی نے اپنے لفظوں پر بہر ا نے سامنے

"ہاں۔۔۔شاید۔۔۔مجھے بھی۔۔باجی۔۔وہ پروفیسر صاحب مجھے بہت پسند ہ،

کو بھی میں پسند ہوں۔" اس نے ایک ہی سانس میں کہہ دیا۔

یکبارگی کئی شیشوں کے ٹوٹنے کی آواز آئی جو صرف تسلیمہ کو سنائی دی۔

☆☆☆

(۲)نازلی

گھر سے نکلتے ہی اس کی نظر ایک کھمبے پر پڑ گئی جس کے ساتھ وہ اپنی کمر سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔''اب میں کیا کروں۔کالج جاؤں تو کیسے جاؤں۔وہ لوفر پھر میرے پیچھے پیچھے آئے گا۔''

''میرے ساتھ تو میری سہیلی چنچل بھی نہیں ہے آج''

''کیا کروں کیسے کالج جاؤں گی آج''۔نازلی دل ہی دل میں یہ باتیں کر رہی تھی۔مگر اس نے چہرے پر کسی ڈر یا خوف کو آنے نہیں دیا۔وہ آگے بڑھنے لگی۔

''اونہہ جیسے میں ان لوفروں سے ڈرتی ہوں۔''دل ہی دل میں اس نے ٹھان لی کہ وہ بنا ڈر کے آگے جائے گی۔وہ آگے بڑھی۔اس کے گھر سے کالج کا راستہ صرف پچیس منٹ کا تھا اور یہ راستہ وہ پیدل ہی طے کرتی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد اسے لگا کہ قدموں کی آواز اس کے پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔اور قدموں کی آواز ذرا سی دیر میں اور زیادہ قریب ہوگئی۔

''سنولڑکی۔اتنا غرور؟۔۔میں تو صرف تمہارا نام جاننا چاہتا ہوں''۔اس نے سامنے آ کر کہا۔

مگر نازلی نے غصہ سے اپنے شانے جھٹک دیئے اور آگے چلدی۔

''نام نہیں بتاؤ گی،میڈم۔۔''

''میں کون ہوں۔کیا ہوں۔تمہیں اس سے مطلب؟لوفر کہیں کا''۔

''اے لڑکی تمہیں معلوم ہے میں انجینئر ہوں''

''ہاں ہاں۔۔کیوں نہیں۔۔وہ تو تیرے لچھن سے ہی معلوم ہوتا ہے۔۔۔اگر انجینئر سڑکوں پر تیری طرح آوارہ پھریں تو کی انہوں نے انجینری۔''نازلی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''تم بڑی ضدی لڑکی ہو۔''اس نے اس کا راستہ روک کر کہا۔

'ہاں ہوں۔۔۔تم سے مطلب۔۔۔چلو ہٹو۔۔میں پولیس والے کو بلاؤں گی۔۔''اس نے تنگ آ کر کہا۔

''پولیس۔۔ارے پولیس تو میری جیب میں ہے۔میرے انکل تو ایس پی ہیں۔''

''شکر ہے یہ نہیں کہا کہ میں ایس پی ہوں۔۔ذرا ہٹ جاؤ۔۔۔۔انکل ایس پی ہے اسی لئے اس قدر بگڑ گیا ہے۔۔۔''

نازلی چل رہی تھی اور وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے باتیں کر رہا تھا۔نازلی چاہتی تھی کہ کوئی اس کی مدد کو آئے اور اس لڑکے سے نمٹ لیں۔مگر کوئی نہیں آیا اور نہ کسی نے اس کی مدد کی۔نازلی کو اور بھی غصہ آیا اور وہ چلائی۔

''دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔اب تم یہاں سے گئے نہیں تو میں چپل سے تمہیں

ڈاکٹر سائرہ کی تو صرف آنکھیں ہی کھلی رہ گیئں۔تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔

''پروفیسر صاحب باجی تو ابھی آئی نہیں ہے۔انہیں کسی کام سے کہیں جانا تھا۔''

''جی میں جانتا ہوں۔۔۔میں۔۔میں۔۔۔اسی لئے۔۔۔۔''

نظریں جھکا کے ''جی۔۔۔وہ۔۔۔''

سائیرہ نے نظریں اٹھائیں جیسے اس کے پورے جملے کا انتظار کر رہی تھی۔مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔صرف ایک مسکراہٹ پر کام چلا لیا۔

سائیرہ نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا اور انہیں اندر لے گئی۔باتوں باتوں میں اس کو اپنے بچپن میں لے گئی اور اس کو اپنی ساری تصویریں بھی دکھائی۔

''میں بچپن میں بہت تیز تھی۔''

''آج بھی تو ماشا اللہ کچھ کم نہیں۔۔''اسی کے ساتھ اسنے اجازت طلب کی۔

''اسے پہلے کہ تمہاری بہن آجائے۔مجھے چلنا چاہئے۔''

''چلیئے انشا اللہ پھر ملاقات ہو گی۔''

سلیم صاحب 'خدا حافظ' کہہ کر چلے گئے مگر سائیرہ ایک عجیب کشمکش میں پڑ گئی۔بہن کے آنے سے پہلے کیوں جانا چاہتے تھے۔

☆

''باجی آج تمہارے پروفیسر صاحب پھر آئے تھے۔''

''کب؟ کیوں؟ کیسے؟''

''وہ شاید آج مجھ سے ملنے آئے تھے۔۔۔۔شاید نہیں۔۔۔۔وہ۔۔۔شاید۔۔میں''وہ ہڑبڑا رہی تھی مگر کوئی جملہ اس سے نہیں بن رہا تھا۔

''کیا تمہیں بھی وہ پسند ہیں۔۔۔سچ بتاؤ۔۔'' باجی نے اپنے لفظوں پر بہت زور ڈالا۔

''ہاں۔۔۔شاید۔۔۔مجھے بھی۔۔باجی۔۔وہ پروفیسر صاحب مجھے بہت پسند ہیں اور ان کو بھی میں پسند ہوں۔'' اس نے ایک ہی سانس میں کہہ دیا۔

یکبارگی کئی شیشوں کے ٹوٹنے کی آواز آئی جو صرف تسلیمہ کو سنائی دی۔

☆☆☆

Aesan

(۲)نازلی

گھر سے نکلتے ہی اس کی نظر ایک کھمبے پر پڑ گئی جس کے ساتھ وہ اپنی کمر سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔''اب میں کیا کروں۔کالج جاؤں تو کیسے جاؤں۔وہ لوفر پھر میرے پیچھے پیچھے آئے گا۔''

''میرے ساتھ تو میری سہیلی چنچل بھی نہیں ہے آج''

''کیا کروں کیسے کالج جاؤں گی آج''۔نازلی دل ہی دل میں یہ باتیں کر رہی تھی۔مگر اس نے چہرے پر کسی ڈر یا خوف کو آنے نہیں دیا۔وہ آگے بڑھنے لگی۔

''اونہہ جیسے میں ان لوفروں سے ڈرتی ہوں۔''دل ہی دل میں اس نے ٹھان لی کہ وہ بنا ڈر کے آگے جائے گی۔وہ آگے بڑھی۔اس کے گھر سے کالج کا راستہ صرف پچیس منٹ کا تھا اور یہ راستہ وہ پیدل ہی طے کرتی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد اسے لگا کہ قدموں کی آواز اس کے پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔اور قدموں کی آواز ذرا سی دیر میں اور زیادہ قریب ہوگئی۔

''سنولڑکی۔اتنا غرور؟۔۔میں تو صرف تمہارا نام جاننا چاہتا ہوں''۔اس نے سامنے آکر کہا۔

مگر نازلی نے غصہ سے اپنے شانے جھٹک دیئے اور آگے چلدی۔

''نام نہیں بتاؤ گی،میڈم۔۔''

''میں کون ہوں۔کیا ہوں۔تمہیں اس سے مطلب؟لوفر کہیں کا''۔

''اے لڑکی تمہیں معلوم ہے میں انجینئر ہوں''

''ہاں ہاں۔۔کیوں نہیں۔۔وہ تو تیرے لچھن سے ہی معلوم ہوتا ہے۔۔اگر انجینئر سڑکوں پر تیری طرح آوارہ پھریں تو کی انہوں نے انجیئری۔''نازلی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''تم بڑی ضدی لڑکی ہو۔''اس نے اس کا راستہ روک کر کہا۔

'ہاں ہوں۔۔۔تم سے مطلب۔۔۔چلو ہٹو۔۔میں پولیس والے کو بلاؤں گی۔۔''اس نے تنگ آکر کہا۔

''پولیس۔۔ارے پولیس تو میری جیب میں ہے۔میرے انکل تو ایس پی ہیں۔''

''شکر ہے یہ نہیں کہا کہ میں ایس پی ہوں۔۔ذرا ہٹ جاؤ۔۔۔۔انکل ایس پی ہے اسی لئے اس قدر بگڑ گیا ہے۔۔۔''

نازلی چل رہی تھی اور وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے باتیں کرر ہا تھا۔نازلی چاہتی تھی کہ کوئی اس کی مدد کو آئے اور اس لڑکے سے نمٹ لیں۔مگر کوئی نہیں آیا اور نہ کسی نے اس کی مدد کی۔نازلی کو اور بھی غصہ آیا اور وہ چلائی۔

''دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔اب تم یہاں سے گئے نہیں تو میں چپل سے تمہیں

ماروں گی۔"

"چپل نہیں سینڈل سے۔کیا تمہیں سینڈل سے مارنا آئے گا۔تم تو نازک سی لڑکی ہو۔"

"جاتے ہو کہ نہیں۔۔ڈھیٹ کہیں کے۔۔" نازلی نے چپل نکالنی چاہی۔اور وہ بھی نو دو گیارہ ہو گیا۔

نازلی کی آواز سن کر ایک دو آدمی دوڑ کر آ گئے اور انہوں نے نازلی سے پوچھا۔کیا بات ہے۔۔۔کیا یہ آپ کو تنگ کر رہا تھا۔"

"ہاں تنگ تو کر رہا تھا۔آپ فکر مت کیجئے۔اب نہیں کرے گا۔"

☆☆

سارا دن کالج میں نازلی بہت ہی اپ سیٹ تھی۔اور اندر ہی اندر ڈر رہی تھی کہ گھر کیسے پہونچے گی۔اگر وہ پھر آ گیا تو کیا کروں گی۔گھر میں ماں سے کہوں گی یا نہیں۔پاپا سے کہنے کی تو بات ہی نہیں۔کیا کروں۔معلوم نہیں اس سے چھٹکارا کیسے پایا جا سکتا ہے۔

گھر جا کر بھی نازلی پریشان تھی۔ماں نے کئی بار پوچھا۔

"نازلی تم پریشان لگتی ہو۔کیا بات ہے"۔

"نہیں مما،۔آپ کو لگتا ہے۔۔میں تو ٹھیک ہوں۔۔"

مگر اندر ہی اندر ایک ڈر۔۔۔صبح شام وہ مصیبت کی طرح نازل ہونے والا ڈر۔۔کبھی آگے اور کبھی پیچھے۔۔"۔

دوسرے دن پھر کالج کی طرف نکلنا تھا۔اس نے سوچا تھا کہ آج وہ بس میں جائے گی تا کہ اس مصیبت سے چھٹکارا پا سکے۔

گھر سے نکلی تو وہ مصیبت نظر نہیں آئی۔خدا کا شکر ادا کیا کہ شیطان آج راستہ بھولا ہے۔اور

کسی اور کام میں پھنسا ہے۔ابھی دو قدم بھی نہیں چل پائی تھی پیچھے سے موٹر بائیک کی آواز آئی اور آواز تیز سے تیز تر ہوئی اور بالکل قریب آ کر رک گیا۔

''میڈم آؤ آج میں کالج میں چھوڑ دوں''۔

نازلی چپ چاپ غصے میں چلتی رہی۔اور وہ موٹر بائیک کو آہستہ آہستہ اسی کے قدموں کے ساتھ چلاتا رہا۔

بس کو قریب دیکھ کر نازلی دوڑ کر بس میں سوار ہوگئی۔اور چین کی سانس لی۔مشکل سے بس میں ایک سیٹ مل گئی اور وہ سیٹ پر بیٹھ گئی۔سیٹ پر بیٹھتے ہی نازلی نے کھڑکی کا شیشہ کھول دیا۔بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔اور بڑی گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔۔۔ابھی سانس بھی لینے نہ پائی تھی کہ موٹر بائیک کی آواز اس بس کے ساتھ اور اسی کھڑکی کے نزدیک ہوئی۔اور وہ شیطان اس بس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔اور بار بار نازلی کو دیکھ رہا تھا۔

نازلی پھر پریشان ہوگئی۔

گھر جا کر اس نے اپنی ماں کو سارا ماجرا سنایا۔ماں نے اس کو بہت تسلی دی کہ وہ اس معاملے کو دیکھ لے گی۔

دوسرے دن ابھی وہ کالج کے لئے تیار ہو رہی تھی کہ نازلی کا ماموں آ ٹپکا۔ماموں نے نازلی کو دیکھ کر ہی کہا۔

''نازلی بیٹا۔آج میں آپ کے ساتھ کالج جا رہا ہوں۔۔ٹھیک ہے؟۔''نازلی بھانپ گئی کہ ممانے اس کو میرے لئے بلایا ہے۔

''جیسا آپ کی مرضی۔''

''نازلی۔میرے پاس آؤ بیٹا۔۔۔میری بات سنو۔۔میں تمہارے ساتھ آؤں گا۔جب وہ

لڑکا تمہیں تنگ کرنے آئے گا تو تم مجھے صرف اسکی طرف اشارہ کرنا۔۔۔بس پھر میں اس کو خود ہی دیکھ لوں گا۔"

"جی ٹھیک ہے۔۔وہ کبھی مجھے چٹھیاں دینے کی کوشش کرتا ہے۔اور کبھی موبائل کا نمبر گھماتا ہے۔کبھی خود کو انجینئر کہتا ہے اور کبھی ڈاکٹر۔ماموں اس نے مجھے اتنا تنگ کیا ہے۔کہ میں تو سوچتی ہوں کالج تو کیا میں جینا ہی چھوڑ دوں گی۔"

"نہیں بیٹا ایسا نہیں کہتے۔۔۔میں اس کو دیکھ لوں گا۔"

ماموں اور نازلی دونوں گھر سے روانہ ہوئے۔اور کچھ قدم چل کر ہی موٹر بائیک کی آواز کانوں میں آ گئی۔نازلی نے دبے ہونٹوں سے اپنے ماموں سے کہا۔"آ گیا ماموں، یہ آواز جب آتی ہے تو میری جان نکل جاتی ہے۔"

"بیٹا تم ڈرو مت۔۔اس کو آنے دو۔۔اور مجھے بس ایک اشارے سے بتاؤ کہ یہی وہ شخص ہے۔۔"

تھوڑی دیر کے بعد یہ لڑکا اس کے قریب سے گذر گیا تو اس نے ماموں کو اشارے سے بتا دیا کہ یہی ہے۔

ماموں نے نازلی کو بس پر سوار کیا۔اور خود اس لڑکے کی گردن پکڑ لی۔اسے چوک ہو گئی کیونکہ وہ موٹر بائیک سٹاٹ ہی نہیں کر پا رہا تھا۔اور اس کے بعد اس کو ایک زور کی پڑ گئی۔"کیا تمہیں اور کوئی کام نہیں"۔

غصہ سے ایک اور تھپڑ ایک اور گال پر دی۔"اگر دوبارہ اس کے سامنے بھی نظر آیا۔یا اس کے پاس بھی پھٹکا۔تو زندگی جہنم بنا دوں گا۔۔۔قتل کر ڈالوں گا تجھے۔" دو چانٹے کھا کر وہ بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

کئی دنوں تک نازلی نے چین کی سانس لی۔ وہ روز کالج کے لئے نکلتی اور دور دور تک اس کا نام ونشان نہیں ہوتا تھا۔ دل ہی دل میں خوش ہوگئی۔

''میں نے پہلے ہی ماموں کو یہ بات کیوں نہیں بولی تھی۔۔۔۔

میں بھی کتنی پاگل ہوں۔۔۔۔

چلو اچھا ہوا۔ دیر سے ہی سہی اس مشکل کا حل تو ہوا۔''

گھر سے نکلتے ہی نازلی کی آنکھیں ادھر ادھر دیکھتیں۔ ہفتہ بھر گذر گیا اور اب آہستہ آہستہ نازلی پھر سے آرام سے پیدل کالج جاتی اور آرام سے واپس آتی۔

ایک دن وہ کالج سے واپس گھر کی طرف آرہی تھی کہ موٹر بائیک کی آواز اس کے کانوں میں پڑ گئی جس نے اسے چونکا دیا۔ اس کا دل دھڑک گیا۔ اس کی گردن اچانک مڑ گئی اور دیکھا کہ پھر وہی لڑکا، جیسے آج ناراض لگ رہا تھا۔۔ اور غصہ سے وہ جیسے پھنکار رہا تھا۔ وہ موٹر بائیک کو قریب سے قریب تر لا رہا تھا۔ اور یہانتک کہ قریب لا کر اس کے جسم کو چھو گیا۔ اس کے سارے بدن میں جیسے سنسنی پھیل گئی۔

''اندھے ہو گیا۔۔۔'' غصہ سے نازلی بولی

''اندھا نہیں ہوں ۔آنکھ والا ہوں۔ اسی لئے تو تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔ آج یا تم رہو گی یا میں۔۔ چاہے کوئی بھی آئے۔ مجھے تم سے کوئی بھی الگ نہیں کرسکتا ہے۔۔۔''

اور قریب اور پھر اور قریب موٹر بائیک آتی گئی۔ اور یہانتک کہ نازلی اپنے آپ کو بچاتی رہی۔ مگر یہ کیا ہو گیا۔؟

بائیک جیسے الٹی ہو گئی اور خود وہ لڑکا جیسے اس کے نیچے آ گیا۔ نازلی نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو۔۔تو۔۔اس کے سر سے خون بہنے لگا۔۔۔۔ یہ کیا ہو گیا؟ یہ کیسے ہو گیا۔۔ اب نازلی

پریشان ہوگئی۔

''سنیے، سنیے۔۔آپ بات کیوں نہیں کرتے۔۔۔کچھ بولئے نا۔۔پلیز۔۔دیکھئے۔۔دیکھئے میں آپ کے پاس ہوں۔'' نازلی کی آنکھوں میں ایک دم آنسو آئے اور وہ رونے لگی۔

وہ لڑکا سڑک پر گرا پڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔نازلی ایک ایک سے روتے روتے کہہ رہی تھی۔

''بھائی صاحب، پلیز۔انہیں اٹھایئے پلیز۔۔hospital لے جایئے۔ ''

''سنیئے۔۔آپ فکر مت کیجئے۔ہم آپ کو ابھی hospital پہونچائیں گے' پلیز ہوش میں آیئے، میں۔۔۔۔میں۔۔۔آپ کے۔۔۔بغیر۔۔نہیں۔۔رہ۔۔پاؤں گی۔میری زندگی میں تو آپ ہی آپ ہیں۔

(۳) پرموشن

''ہائے میری پرموشن ! تو آخر کار آہی گئی۔ میں جانتی تھی کہ
''رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن''

وہ ہنستے ہوئے آڈر کو ہاتھ میں لیکر ڈرائنگ روم سے نکل کر (جہاں ڈاکیہ نے اسکے ہاتھ میں آڈر تھما دیا تھا) بیڈروم کی طرف چلی گئی اور اپنے شوہر سے کہا۔

''سنو جی! میں نہ کہتی تھی کہ کبھی نہ کبھی میری تو پرموشن آہی جائیگی۔ دیکھو آج آڈر آگیا۔''

اسکا شوہر بسترے سے اچھل کر بیٹھا۔ حیرانگی کے عالم میں پوچھا۔ ''پرموشن؟''

''ہاں پرموشن''۔ اس سے پہلے کہ آمنہ کا شوہر اور کچھ کہتا آمنہ کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

آمنہ نے اس دن کا بہت ہی برسوں سے بے صبری سے انتظار کیا تھا۔ اس نے پچیس سال پہلے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ایک ٹیچر کا پوسٹ

اس کے لئے ناکافی ہے۔لیکن جب ایک بار ٹیچر کے پوسٹ پر فائز ہو گی تو اسکو کہا گیا کہ سات سال کے بعد تمہاری پرموشن ہو جائے گی اور اسکے بعد تم آٹو میٹکلی لکچرار بن جاؤ گی۔جب اسنے اپنی نوکری کے نو سال بھی ختم کیے' تو دفتروں کے چکر کاٹنے لگی۔وہ سکولوں میں نوکری کرتی رہی۔لیکن اسکا دل کالج کے بچوں کی طرف مائل تھا۔وہ کسی خاص مضمون (اردو) کی لکچرار بننا چاہتی تھی۔لیکن سکول میں اسے کبھی انگریزی' کبھی حساب' کبھی سائینس اور کبھی سوشل سٹڈیز پڑھانا پڑتی تھی۔ وہ پڑھاتی جاتی تھی اور اس دن کا انتظار کرتی تھی کہ شاید کوئی دن ایسا آجائے گا جب وہ ایک لکچرار بن جائے گی اور بچوں کو اپنا من پسند سبجکٹ پڑھائے گی۔

ایک سکول سے دوسرے سکول' دوسرے سے تیسرے' تیسرے سے چوتھے سکول میں اسکا تبادلہ ہوتا گیا اور زندگی آگے بڑھتی رہی۔شادی ہوئی۔ بچے ہوئے۔ بچے بڑے ہوئے۔لیکن پرموشن نہ ہوئی۔بچوں کے بچے ہوئے۔لیکن پرموشن نہ ہوئی۔ جب کبھی اس نے دفتر کے چکر لگائے تو دفتر والے آج کل کر کر کے ٹالتے رہے۔ نو۔۔دس۔۔۔گیارہ۔۔۔بارہ سال کی سروس کرتے کرتے اسنے بیس سال تک سکول کی سروس کی۔مگر پرموشن نہ ہوئی۔جبکہ اس سے جونئیر اساتذہ پرموٹ ہوتے گئے۔

وہ جدو جہد کرتے کرتے تھک گئی۔وہ بیمار رہنے لگی۔دل کی تمنا دل میں ہی رہ گئی۔کبھی کبھی اس کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔

لیکن آج اسکی حیرت کی کوئی انتہا ہی نہ رہی جب پوسٹ مین نے اسکے ہاتھ میں آڈر تھما دیا۔اسکے ایک ہاتھ میں پرموشن کا آڈر تھا۔مگر اسکی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ کہے جا رہی تھی۔

''میری پرموشن! آخرتو آہی گی ۔ میرے اتنے انتظار کے بعد وہ گھڑی آہی گئی۔ جب میرے دل کی مراد بھرآئی۔ اور میں لکچرار بن گی ۔''

اسی لمحے اسنے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

''میری پرموشن ہوگی ۔ میری پرموشن ہوگئی۔ آخرکار پرموشن ہو ہی گئی۔ بھلے ہی میرے ریٹائرمنٹ کے دو مہینے بعد۔۔۔

☆☆☆

(۴) ایک دن کی حکومت

عارفہ نوکری ڈھونڈ رہی تھی ۔اور جگہ جگہ تلاش جاری تھی ۔اس نے بی اے کرلیا تھا۔لیکن جہاں بھی وہ نوکری مانگنے جاتی تھی ہر جگہ سے ایک ہی سوال اور ایک ہی جواب سننے کوملا۔

''کتنا پڑھی لکھی ہو۔کمپیوٹر آتا ہے کہ نہیں۔''

''بی اے ہوں سر۔وہ جواب دیتی

''بی اے؟ یہ بھی کوئی ڈگری ہے۔آج کل تو چپراسی بھی ایم۔اے کئے ہوئے ہیں۔''

اس نے ایم۔اے پرائیویٹ کرنا شروع کیا۔اس بیچ اسکوایک پرایؤیٹ سکول کی نوکری مل گی اور وہ نوکری کرنے لگی۔

اسے نوکری کی تلاش کسی ضرورت کی وجہ سے نہ تھی ۔اسکا باپ گزٹیڈ آفیسر تھا اسکا بھائی بھی انجینر تھا۔پھر بھی اسے نوکری کی تلاش تھی ۔دراصل وہ اب جوان ہو چکی تھی اور

جہاں کہیں سے بھی رشتہ آتا تھا لڑکے والے پہلی بات یہی پوچھتے تھے۔لڑکی نوکری کرتی ہے یا نہیں۔اسی لئے اسے اپنے باپ نے کہا تھا کہ نوکری کی تلاش جاری رکھو۔شاید اس سے کوئی بات بن جائے۔اسی لئے جب نوکری مل گی تو اس نے سکھ کی سانس لی۔اس نے سمجھا کہ شاید اس کے غموں کا کچھ حصہ کم ہو گیا۔

دراصل وہ گھر میں اکیلی لڑکی تھی۔اسکے بھائی اور باپ کو ہمیشہ اسکی شادی کی فکر لاحق ہوتی تھی۔

''ابا انشااللہ ہماری بہن کو اتنا اچھا گھر اور ور ملے گا کہ سب دیکھتے رہ جائیں گے۔'' عارفہ کے بھیا اپنے ابا کو سمجھاتے، جب وہ انہیں عارفہ کی فکر کرتے دیکھتے۔

''میں تو کہتا ہوں کہ اب لڑکی کی شادی ہو جانی چاہئے۔گھر میں کس چیز کی کمی ہے۔خدا کا دیا سب کچھ ہے۔'' ابا فکر مند ہو کر کہتے۔

''اور کیا۔اب تو جہیز کی ساری چیزیں بھی تیار ہو گئی۔''

''اب صرف ایک اچھا لڑکا مل جائے۔''

''ملے گا ضرور ملے گا۔میری بہن تو لاکھوں میں ایک ہے۔دیکھنا کیسا لڑکا مل جائے گا۔آپ اب دیکھتے رہیئے۔

مگر جب کبھی کبھی عارفہ کی ماں فکر کرنے لگ جاتی تو انہیں ابا ہی سمجھاتے۔

''فکر کرنے کی کوئی بات نہیں ہے اللہ پر بھروسہ رکھو۔ہماری بیٹی تو لاکھوں میں ایک ہے۔کون سا کام ہے جو اس کو نہیں آتا۔اتنی ہنر مند لڑکی کہ کوئی بھی اس کا رشتہ مانگ سکتا ہے۔''

وہ سوچتا تھا کہ میری نوکری چل رہی ہے۔اور لڑکی بھی ابھی پڑھائی کر رہی ہے۔رشتے تو

آتے رہیں گے اتنی جلدی بھی نہیں ہے۔

ابّا رٹائیر ہو گئے۔مگر ابھی تک عارفہ کی شادی کی بات پکی نہیں ہوئی تھی۔روز میاں جی تو آتا تھا۔مگر کوئی اچھا گھر یا رشتہ لیکر نہیں آیا تھا۔جس کے ساتھ وہ اپنی بیٹی کی بات آگے بڑھاتے۔

اسکا ماتھا تو اسوقت ٹھنکا جب میاں جی نے کہا۔

''صاحب ایک لڑکے والے تو تیار ہو گئے تھے مگر جب انہوں نے سنا کہ آپ ریٹائیر ہو گئے تو انہوں نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ باپ ریٹائر ہو گیا ہے تو وہ بیٹی کو کیا دے گا۔''

بے چارہ باپ۔اس کو اب پریشانی تھی تو صرف ایک بات کی' کہ بیٹی کے لئے ایک اچھا سا شوہر مل جائے۔جو ہر طرح سے اسکی بیٹی کے لایق ہو۔پڑھا لکھا ہو، ہر طرح سے اسکا خیال رکھنے والا ہو۔بیٹی کے لئے ماں باپ کو اور کیا چاہیئے۔

عارفہ ایک حسین اور نازک بدن کی لڑکی تھی ۔بڑی بڑی آنکھیں، گھنی بھنویں۔اور اسکے علاوہ گھر کے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹانے والی لڑکی ۔جسمیں گھر کے متعلق ہر صفت موجود تھی اور اسکے علاوہ حسنِ اخلاق کی پیکر تھی۔

اسکے باپ کی پریشانی روز بروز بڑھتی گی ۔ جہاں لڑکے کا رشتہ آیا وہاں لڑکے کی مانگ ہے''لڑکی نوکری کرتی ہے یا نہیں؟''

جب سے عارفہ نوکری میں لگ گئی تو مانگ نے رخ بدل دیا۔لڑکے والوں نے پوچھا۔

''سرکاری نوکری کرتی ہے یا نہیں؟۔ایسی لڑکی نہیں چاہیئے۔''

'' پرائیوٹ؟''

''نہیں۔نہیں۔ پرائیویٹ سکول میں کیا دیتے ہیں ''؟

''کتنا کماتی ہوگی؟''

عارفہ تنہائی میں اکثر سوچتی کہ وہ لڑکیاں کتنی خوش نصیب ہوتی ہیں جنکو خوش نصیب لڑکے ملتے ہیں۔ جن لڑکوں کو یہ غم ہی نہیں ہوتا کہ لڑکی نوکری کرتی ہے یا نہیں۔ سکینہ کو دیکھئے معمولی خدوخال کی لڑکی، لیکن اس کا شوہر اس پر جان چھڑکتا ہے۔

سکینہ اسکی سہیلی تھی۔ جو میٹرک پاس کر کے ہی گھر میں بیٹھی۔ صرف گھر کے کام کاج میں ماہر تھی۔ لڑکا ایسا ملا جس کو صرف گھریلو لڑکی سے شادی کرنی تھی۔ عیش کر رہی ہے۔ نہ نوکری کی جھنجٹ نہ۔۔۔۔

اب عارفہ اکثر اس بات پر آگ بگولہ ہو جاتی تھی۔ اور اکثر کہتی رہتی تھی۔

''کاش حکومت ایک بار میرے ہاتھ میں آجائے۔ پھر دیکھنا''

ایک بار یہی بات اپنی سہیلیوں کے درمیان کہتی رہی۔ تو سہیلیوں میں سے ایک نے پوچھا۔ ''اگر حکومت سچ مچ تمہارے ہاتھ میں آجائے تو کیا کرو گی۔؟

'' اگر حکومت ایکدن سچ مچ میرے ہاتھوں میں آجائے تو جانتی ہو میں سب سے پہلے کونسا قانون لاگو کروں گی؟''

'' کنواری لڑکیوں کو نوکری نہیں ملے گی ''

لڑکیاں حیران ہو گئیں اور انہوں نے پوچھا۔ ''اس سے کیا ہوگا بھلا''۔

'' ہوگا یہ کہ سب نوکریاں پہلے لڑکوں کو ملیں گی۔ کنواری لڑکیوں کی شادی ہو جائے گی۔ شادی کے بعد یہ شوہر کی پریشانی ہوگی کہ بھلا وہ بیوی سے نوکری کرائے گا یا نہیں۔ اسطرح نہ لڑکے نوکری کے لئے پریشان رہیں گے اور نہ لڑکیاں کنواری رہیں گی۔''

” یہ تو بہت اچھا سجھاؤ ہے۔ خدا کرے کہ تمہیں ایک دن کی حکومت مل جائے اور ھم سب سے نوکری کا جھنجٹ ہی ختم ہو جائے۔“

اس کی سب سہیلیوں نے یک جھٹ ہو کر کہا۔

” ہاں بھئی، کچھ ایسا ہی ہونا چاہئے۔ پہلے تو ماں باپ کے سر سے بیٹی کا بوجھ اتر جائے اور اس کے بعد شوہر کی مرضی کہ وہ اپنی بیوی سے کیا کرائے۔ نوکری یا گھر کی ذمہ داری اسے سونپ دے“۔

عارفہ کے ماتھے کی لکیریں کچھ زیادہ ہی گہری ہو گئیں تھیں لیکن وہ خاموش ہو گئی۔۔۔۔۔

کمرے میں اندھیرا چھانے لگا۔ پہاڑوں سے شام تیزی سے اتر رہی تھی۔۔۔۔

☆☆☆

(۵) تلاش

ان کا بیٹا انجینئر تھا اور وہ اپنے بیٹے کے لئے انجینئر بہو لانا چاہتے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ آجکل کتنی ہی لڑکیاں انجینئری پڑھتی ہیں۔ انہوں نے درمیانہ داروں سے کہہ دیا تھا کہ اگر لڑکی ہو تو انجینئر ہو۔ ورنہ نہیں۔

منظور صاحب اور اسکی بیوی نے اپنے بیٹے کو انجینئر بنایا تھا اور وہ بھی پرایوٹ کالج میں۔ اس پر ایک بڑی رقم خرچ ہو گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ جتنا بھی روپیہ پیسہ اس پر خرچ ہو گیا ہے۔ اس سے کی گنا زیادہ انکے ہاتھ آجائے، اور لگے ہاتھوں ایک بہو بھی مل جائے۔ جو تنخواہ بھی لاتی رہے۔ اور گھر کا کام کاج بھی کرتی رہے۔ وہ اپنی اس سوچ پر دل ہی دل میں خوش تھے۔

وہ ایسا ہی رشتہ تلاش کر رہے تھے۔ اور ہر طرف اپنی نظریں دوڑا رہے تھے۔ تمام رشتہ داروں میں بھی یہ بات پھیلی تھی کہ وہ انجینئر بہو لانا چاہتے تھے۔ بالآخر انکی یہ تلاش اختتام کو پہونچ ہی گئی۔

شاذیہ خوبصورت، کم زبان ،اور دلکش لڑکی تھی۔ ابھی اس کو نوکری نہیں ملی تھی مگر نوکری کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔۔۔ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی کا رشتہ کسی ایسے لڑکے سے ہو جائے جو امریکہ یا سعودی عرب میں نوکری کرتا ہو۔ اگر ہندوستان سے باہر دنیا کے کسی بھی گوشے میں نوکری کرتا ہو تو وہ بھی چلے گا۔ اور اسکے علاوہ وہ چاہتے تھے کہ کسی ایسے لڑکے سے شادی کرادی جائے جو ہر طرح سے شاذیہ کے لائق ہو اور شاذیہ کو خوش رکھ سکے۔

ریاض دیکھنے میں ایک اچھا لڑکا تھا۔ خوبرو، جوان اور کم گو۔ اسکو ابھی ابھی نوکری مل گئی تھی اور نوکری بھی امریکہ میں۔ شاذیہ کے گھر جب رشتے کا پیغام آیا انہوں نے جھٹ سے ہاں کردی۔ لڑکا امریکہ میں تھا۔ انجینئر تھا۔ اور کیا چاہئے تھا ان کو۔

لڑکے کو دیکھنے کی باری جب آئی تو لڑکے والوں نے کہا۔ اس کو دیکھنے کی ضرورت اگر ہے تو آپ اسکو انٹرنیٹ سے دیکھ سکتے ہیں۔ لڑکے اور لڑکی نے ایک دوسرے کو انٹرنیٹ کے ذریعہ دیکھا اور اقرار ہو گیا۔

لڑکا امریکہ سے آیا۔ شادی ہو گئی۔ لڑکی خوشی خوشی وداع ہو گئی۔ سب لوگ خوش تھے۔ شاذیہ تو بہت خوش تھی۔ نیا گھر، نئے لوگ ،نیا ماحول ،سب کچھ نیا تھا۔

مگر پہلے ہی دن اس نے ریاض میں کچھ بجھا بجھا پن دیکھا۔ وہ کسی انجانے خوف سے ڈرنے لگی۔ اس کے دل میں طرح طرح کی الجھنیں پیدا ہو گئیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی سوچتی تھی امریکہ جائے گی تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ شاید یہ اسکے دل کا وہم ہے۔

وہ دل میں سوچتی تھی کہ چاہے چھ بھی ہو جائے وہ کسی بھی طرح ایڈجسٹ کر لے گی۔

مگر۔۔۔۔۔۔اسکے دل میں ایک کھٹک سی تھی۔ وہ کھٹک کیسی تھی۔؟

''کیا وہ صحیح جگہ پہ آ گئی ہے۔۔۔۔''

''کیا یہی وہ سپنا ہے جو اس نے دیکھا تھا۔۔۔۔''

''کیا یہی اس کی چاہت تھی۔۔۔۔۔''

ریاض امریکہ چلا گیا اور یہ کہہ کر گیا کہ ''ٹکٹ بھیج دونگا تو چلی آنا''۔

وہ انتظار کرتی رہی۔۔۔دن مہینوں میں بدل گئے اور مہینے ۔۔۔۔۔مگر نہ تو ٹکٹ ہی آیا اور نہ کوئی خبر۔

شاذیہ کے والدین نے معاملے کی نزاکت کو محسوس کیا۔انہوں نے کچھ سوچ کر ٹکٹ لے کر اسے امریکہ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

وہ امریکہ جانے کے لئے تو تیار تھی مگر دل ہی دل میں پریشان تھی۔جانے کیوں ایک انجانا سا خوف اسکے من میں بیٹھ گیا۔اسکے ہونٹوں پر اپنے والدین کو خوش رکھنے کے لئے مسکراہٹ تھی مگر اندر سے غم کے اندھیروں میں ڈوبتی جا رہی تھی۔گھر والوں نے خوشی خوشی وداع کیا اور وہ چلی گئی۔خدا خدا کر کے وہ امریکہ پہونچی۔

امریکہ پہونچ کر شاذیہ نے دیکھا کہ ریاض کے گھر میں ایک خوبصورت سی لڑکی تھی۔شاذیہ نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ یہ کون ہے۔لیکن وہ لڑکی سامنے آئی اور ہاتھ ملاتے ہوئے بولی۔

'' میں ڈاکٹر صائمہ۔مسز ریاض۔اور آپ۔۔۔۔؟''

''مسز ریاض ؟'' حیرانگی میں شاذیہ تقریباً چلا اٹھی۔وہ ایک نظر ڈاکٹر صائمہ کو دیکھ رہی تھی اور ایک نظر ریاض کو۔اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا کہہ رہی ہے اور کیوں کہہ رہی ہے۔اسنے اپنے لفظوں کو دہرایا۔

''مسز ریاض؟''

ڈاکٹر صائمہ بول اٹھی۔''جی ہاں دلہن صاحبہ میں اس کی بیوی ہوں۔اور وہ بھیone piece میں۔

'' تو پھر میں کون ہوں ''؟

ریاض نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

'' تم میرے والدین کی بہو ہو۔اور وہ بھی انجینئر بہو۔''

☆☆☆

(۶)وارث

تنویر احمد ڈرائنگ روم میں صوفے پر لیٹے ہوئے تھے۔ان کا نوکر ہاتھ میں جوس کا گلاس لئے کھڑا تھا۔لیٹتے لیٹتے شاید ان کی آنکھ لگ گئی تھی نوکر جب تک جوس لیکر آیا تھا۔اس نے صاحب کو جگانا مناسب نہیں سمجھا۔تھوڑی دیر کے بعد ان کی آنکھ کھل گئی تو دیکھا کہ گُلّو گلاس لیکر کھڑا ہے۔اس کو انہوں نے تحسینی نظروں سے دیکھا اور ٹیبل کے ڈراور سے دوائی نکال کر جوس کا گلاس ہاتھ میں لے لیا۔ساتھ ہی ساتھ گلّو سے کہہ دیا۔

''کل دیر رات تک میں سو نہیں پایا۔ڈاکٹر صاحب لندن سے فون کر رہے تھے۔ فون پر بات کرتے کرتے ایک بج گیا۔اس کے بعد مجھے نیند نہیں آئی۔''

''کیا کہہ رہے تھے ڈاکٹر صاحب۔کوئی خاص بات تھی۔'' گلّو نے پوچھا۔

''نہیں بھئی۔کچھ خاص نہیں۔وہ لندن آنے کو کہہ رہے تھے''۔

''جائیے نا سرکار!۔آپ تو یہاں بالکل اکیلے ہو گئے ہیں۔ڈاکٹر صاحب ٹھیک ہی کہتے ہیں۔'' گلّو نے کہا۔

ابھی یہ لوگ باتوں میں مصروف ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔گلّو نے فون اٹھایا اور

چلا آیا۔

''بے بی صاحب آپ؟''

''اسلام وعلیکم میں گلو۔ جی جی صاحب یہاں ہی ہیں۔''

اس نے تنویر صاحب کی طرف فون بڑھاتے ہوئے بولا۔

''سعودی سے بے بی صاحب ہیں۔'' گلو خوش ہو گیا اور اپنے آپ ہی ہنسنے لگا۔ دل ہی دل میں کہنے لگا۔ بیٹا لندن سے فون کرتا ہے تو بیٹی سعودی سے۔ ایک اور بیٹا بھی ابھی امریکا سے فون کرے گا۔ میرا صاحب کتنا خوش نصیب ہے تینوں اولاد آباد ہیں۔ ایک لندن میں ڈاکٹر ہیں تو دوسرا امریکہ میں ڈاکٹر ہے۔ بیٹی بھی ڈاکٹر ہے اور داماد بھی۔ یہاں تو ڈاکٹروں کی لائین لگی ہے۔ گلو ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ تنویر صاحب کی آواز اسکے کانوں میں پڑی۔

''اچھا بیٹا خدا حافظ''

اور اسی کے ساتھ تنویر صاحب نے فون کریڈل پر رکھ دیا۔ گلو نے جیسا سوچا تھا ویسا ہی ہوا۔ بے بی صاحب نے فون رکھدیا تو 'چھوٹے صاحب' کا فون آ گیا۔ صاحب نے اس کے ساتھ بھی دس پندرہ منٹ بات کی اور فون رکھدیا۔ اور گلو سے کہنے لگا۔

''سارا دھیان ان کا میری طرف ہے۔ سب کہتے ہیں یہاں آ جاؤ۔ وہاں جا کر بھی کیا کروں گا۔ ملک بھی غیر ہے۔ لوگ بھی غیر ہیں۔ رسمیں بھی غیر ہیں، مذہب بھی غیر ہے، میرا تو بالکل وہاں دل نہیں لگتا ہے۔ ابھی چھ مہینے پہلے ہی تو سعودی گیا تھا۔ اب دوبارہ کہیں نہیں جاؤں گا۔ بیٹی بھی بار بار کہتی ہے کہ یہاں آ جاؤ۔ مجھے سمجھ نہیں آتا ہے کہ کیا کروں۔ اگر میں بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلا گیا تو یہاں کون رہے گا۔ یہاں اتنی بڑی

کوٹھی بنائی ہے۔اس میں عیش وآرام کا ہر سامان مہیا رکھا ہے۔

زندگی بھر میری بیوی نے ایک ایک چیز جمع کر کر کے اس میں سجائی ہے۔ ہر چیز میں اس کی روح نظر آتی ہے۔ میں بھی گیا تو اس مکان کو تالا لگ جائے گا۔''

ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے تنویر صاحب نے دل کی بات گلو کو بتادی۔

''مگر صاحب، مکان کی چوکیداری کے لئے آپ تو یہاں نہیں رہیں گے۔ چوکیداری کے لئے ہم خدمت گار جو ہیں آپ کے پاس''۔گلو نے تسکین آمیز لہجے میں کہا۔

تنویر صاحب ایک بہت بڑے سرکاری افسر تھے۔ کچھ برس پہلے ہی وہ ریٹائر ہو چکے تھے۔اس نے اپنے دونوں بیٹوں اور بیٹی کو ڈاکٹر بنایا تھا اور ملک سے باہر مزید پڑھائی کی غرض سے بھیج دیا۔پھر انکی شادی بھی ہوگئی اور دونوں وہیں Settle ہو گئے۔ بیٹی کی شادی بھی ڈاکٹر سے کردی اور وہ بھی قطر چلی گئی۔مگر اس نے کبھی بچوں سے کوئی شکایت نہیں کی۔اس کی بیوی اس کے ساتھ تھی۔وہ دونوں خوشی سے اپنی زندگی گذارتے تھے۔

مگر پچھلے سال اسکی بیوی ہارٹ اٹیک کی وجہ سے اس دنیا سے چل بسی۔اور تینوں بچے چھٹی نہ ملنے کی وجہ سے گھر نہ آسکے۔وہ ٹیلفون پر ہی اظہار غم کرتے رہے۔ بیٹی کی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئی۔کاش وہ ڈاکٹر کی تجویز کردہ قیمتی دوا بھیجنے میں تاخیر نہ کرتے۔وہ بھی کیا کریں۔ان کو کام سے لمحہ بھر کی فرصت نہیں ملتی۔وہاں نوکری کرنا چاکری سے بدتر ہے۔ ہر پل کارکردگی کا محاسبہ۔۔۔۔

تنویر صاحب دنیا میں بالکل تنہا رہ گئے۔ان کو دنیا کی کوئی خوشی خوشی نہیں لگتی۔ اگر گلو بھی نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔گلو تو جی جان سے ان کی خدمت کرتا ہے۔

گلو ہر وقت اپنے مالک کے پاس بیٹھتا تھا۔ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا۔پانی

،دودھ،دوائی،کھانا،روٹی جو چاہیے ہوتا تھا وہ تیار ہوتا۔

ایک دن گلو شام کو اپنے صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔اچانک اس کو لگا کہ صاحب کسی گہری سوچ میں ہیں اوران کی آنکھیں پرنم ہیں۔

گلو پریشان ہوا،وہ صاحب سے پوچھنے کی جرأت نہ کر سکا کہ وہ کیوں رو رہے ہیں۔

شاید تنویر صاحب کے دل میں بہت سارے سوالات تھے جو ہونٹوں پر جم گئے تھے۔نہ کچھ کہتے تھے اور نہ ہی چپ رہ سکتے تھے۔۔۔۔۔

شاید صاحب کو اپنے بچوں کی یاد آرہی تھی۔شاید ان کی صحت خراب ہوتی جارہی تھی۔وہ من ہی من کچھ سوالات کرتا ہے اور من ہی من ان کا جواب بھی دیتا رہا۔وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا۔اور سوچے جارہا ہے۔وہ سمجھ نہیں پایا کہ صاحب کے من میں کیا ہے۔ صاحب سے آنسوؤں کی وجہ پوچھنے میں کیا حرج ہے؟۔وہ ڈرتے ڈرتے ان کے قریب آیا۔بڑی عاجزی کے ساتھ کہا۔

''صاحب اگر آپ کی اجازت ہوتو میں یہاں آپ کے قدموں میں پڑا رہوں گا۔میں آپ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔۔۔۔شاید آپ کی طبعیت ٹھیک نہیں ہے۔۔۔'' وہ گلو گیر لہجے میں بولا۔

''اگر مجھے ضرورت پڑے گی میں تم کو بلا لوں گا۔ گلوؔ''

''نہیں صاحب آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔میں یہاں ہی رہوں گا۔''

''نہیں گلو۔۔۔نہیں۔۔بیٹا اگر طبعیت زیادہ خراب ہوگی تو تمہیں بلا لوں گا۔''

گلو نے کتنے جتن کیے مگر وہ نہ مانے۔ایک ہی رٹ لگائی تھی۔کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔

صبح سویرے جب گلو چائے کی ٹرے لیکر صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ صاحب صوفہ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔اور صوفہ کے پچھلے حصہ کے ساتھ ٹیک لگائے سوئے ہیں۔گلو سامنے گیا۔اس نے دو تین بار آواز دی۔۔۔ان کے جسم کو سہلانا چاہا۔مگر وہ منجمد ہو چکے تھے۔اس کو لگا کہ صاحب آخری نیند سو گئے ہیں۔مگر ان کے ہاتھوں میں قلم اور کچھ کاغذ ہیں۔گلو نے چلاتے چلاتے پورا محلّہ جمع کیا۔اور ان کے رشتہ داروں کو بھی فون پر اطلاح دی۔

گلو صاحب کی تکفین و تدفین میں پیش پیش رہا۔کون کہتا ہے کہ صاحب بڑے آدمی تھے۔ماتم گساروں میں کوئی معمر شخص کہہ رہا تھا۔تنویر صاحب نے کس درد اور محنت سے اپنے بچوں کو پڑھایا۔لکھایا۔اچھی سے اچھی تعلیم دی۔ڈاکٹر بنایا۔مگر آج خود علاج سے محروم رہے۔انہوں نے کبھی اپنے بچوں کی شکایت نہیں کی ۔بلکہ الٹا ان کو سمجھاتے تھے۔میرے لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

جب میت کو سپردِ خاک کرنے کے بعد کچھ رشتے کے لوگ ان کے گھر گئے۔ان میں سب سے زیادہ مایوس اور غمزدہ گلو تھا۔وہ طے کر رہا تھا کہ وہ اب واپس اپنے گاؤں چلا جائے گا۔اور اپنے کپڑے بھی نہیں لے گا۔اتفاقاً اس کی نظر اس کاغذ اور قلم پر پڑی جو الماری کے اوپن شلف (open self) میں پڑا تھا۔۔۔۔۔۔جو مرتے وقت تنویر صاحب کے ہاتھ میں تھا۔۔۔۔معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنی تمام جائداد گلو کے نام کر دی ہے اور گلو کو ہی اپنا وارث بنا دیا ہے۔

☆☆☆☆

شکست

وہ اسے آج بھی چاہتی تھی لیکن دل ہی دل میں۔ اسے دیکھنے کے لیے بیقرار رہتی تھی۔ اسکو ملنے کے لئے بے تاب رہتی تھی لیکن جب اس سے ملتی تھی تو اس پر کبھی یہ ظاہر نہ ہونے دیتی تھی کہ وہ اسکو دیکھنے آئی ہے۔ شاید یہ اسکے اَنا کو ٹھیس پہونچانے کہ بات تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ مُنیر بھی اسے چاہتا ہے کہ نہیں۔ وہ بس اسکی آنکھوں میں دیکھ لیتی تھی۔ ان آنکھوں کو صرف اپنے اندر محسوس کرتی تھی۔ اس چبھن کا احساس بھی وہ منیر کو نہیں دینا چاہتی تھی۔

مُنیر بھی شاید اسکو چاہتا تھا پہلے کی طرح۔ مگر صرف اپنی آنکھیں اُٹھا کر اسکو دیکھ لیتا تھا بس پھر نظریں جھکا لیتا تھا جیسے کوئی چوری پکڑی گی ہو۔ نبیلہ کوئی بات کرتی تو اسے تحسین کی نگاہوں سے دیکھتا۔ وہ کسی کے ساتھ ہنس بول لیتی تو ایکدم بات کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ وہ کسی کے پاس بیٹھ جاتی تو رشتہ ٹٹولنے کی کوشش کرتا۔ شاید اسی لئے

کہ وہ بھی اسے آج بھی پیار کرتا تھا۔مگر دونوں کے بیچ ایسی دوری پیدا ہوگئی تھی کہ کوئی کسی کو جی بھر کر دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔

آج سے کئی سالوں پہلے نبیلہ اور منیر ایک دوسرے کے ساتھ پڑھتے تھے۔ وہ اکھٹے ایم اے کرتے تھے۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے دلوں میں رہتے تھے۔ گھنٹوں ایک جگہ بیٹھ کر باتیں کرتے۔

''نبیل ۔چلو کہیں دور چلیں، اس دنیا کی نظروں سے کہیں دور چلیں جائیں۔ بیٹھ کر باتیں کریں گے اور جی بھر کر باتیں کریں گے''۔

''چلو۔مگر اگر کسی نے دیکھ لیا،تو کیا کریں گے''۔

''اچھا ہی تو ہوگا۔ اگر کوئی دیکھ لے گا۔ دنیا کو معلوم ہوگا کہ ہم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں''

''مگر منیر۔ میں دنیا سے بہت ڈرتی ہوں۔''

''پیار کرنے والے ڈرتے نہیں ہیں۔''

''میں دنیا والوں کی طرح مضبوط نہیں ۔ میں ایک کمزور لڑکی ہوں۔ مجھ میں زمانے سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔''

''لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔؟ مگر کیا میرے بغیر رہ سکتی ہو۔؟''

''نہیں، رہ تو نہیں سکتی مگر۔۔۔ مجھے والدین کی عزت بھی بہت پیاری ہے۔اس کے لئے میری محبت تو کیا میں اپنی جان بھی قربان کرسکتی ہوں''

وہ اتنی باتیں کرتے تھے کہ سارا دن باتیں کرنے کے بعد ان کا دل ہی نہیں بھرتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مُنیر بولتا تھا اور نبیلہ چپ چاپ اسکی باتیں سنتی۔ اسکی آنکھوں میں جھانکتی اور کبھی 'ہوں' اور کبھی 'ہاں' اور کبھی پلکیں جھکا کر اسکی باتوں کا اقرار کرتی۔ اسکی کسی

بات سے وہ انکار نہیں کرتی تھی اور نہ ہی کسی بات کے ہونے نہ ہونے پر اعتراض کرتی تھی۔اور جس وقت وہ کوئی بات کرتی تھی تو منیر اسکو اسطرح ٹکٹکی باندھے دیکھتا تھا کہ وہ کلیجہ تھام کر رہ جاتی۔اور اسی اثنا میں اگر نبیلہ کوئی بات غلط بھی کہہ جاتی تو منیر کہہ اُٹھتا۔

''نبیل مجھے تو تم سے ہے پیار' تمہاری ہر ادا سے' تمہاری ہر غلطی سے' تمہارے ہر قدم سے' تمہاری ہر نظر سے' تمہاری ہر بات سے۔۔۔۔۔''

وہ دیوانی یہ الفاظ سن کر تو اور بھی دیوانی ہو جاتی تھی۔اسکے کلیجے میں ایک درد سا ہونے لگتا تھا۔وہ آنکھیں بند کرتی تھی اور چاہتی تھی کہ وہ اسکو اپنے کلیجے کے اندر چھپا لے۔دونوں پر ایک دیوانگی چھائی ہوئی تھی۔

اس دیوانگی کی حدان دونوں کی شادی تھی۔مگر ایک دوسرے کے ساتھ نہیں بلکہ منیر کی شادی اسکے گاؤں کی کسی لڑکی سے کردی گئ اور پھر نبیلہ کی شادی بھی برادری کے کسی لڑکے سے کی گی۔ دونوں میں اتنی جرأت نہ تھی کہ گھر والوں کے سامنے کوئی مُنہ بھی کھولتا۔دل کی بات دل میں رہ گئی اور محبت درد میں بدل گی۔

بہت دن، مہینے،سال گذر گئے۔کئی سالوں کے بعد یہ دونوں پھر کسی دفتر میں آکر ملے۔ پہلے تو آنکھ اُٹھاتے ہوئے بھی جیسے ڈرتے تھے پھر ملاقات ہوئی۔ نہ گلے ہوئے۔نہ شکوے ہوئے۔ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھا۔پھر بات ہوئی اور پھر۔۔۔۔۔

۔۔۔دل کی باتیں ہونے لگی۔پھر بے قراری بڑھی۔پھر دیدار کی تمنا جاگی۔اور پھر۔۔۔آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا نیا انداز' جیسے پرانی محبت پھر سے رنگ لائی۔جیسے دونوں کے بیچ کی دوری تھی ہی نہیں۔بیچ کے چھ سالوں میں کیا ہوا کسی نے پوچھا ہی نہیں یا جیسے کسی کو یاد ہی نہیں۔یہ ٹیلیفون کا نمبر گھما۔وہ اسنے ٹیلیفون اُٹھایا۔یہ بات ہوئی۔

کبھی لفظوں میں، کبھی کوڈ میں اور کبھی کھلے عام۔ جسطرح کا موسم اسطرح کی بات۔

لیکن اس دن تو نبیلہ کا ماتھا ٹھنکا جب اسنے فون کا نمبر گھمایا تو منیر نے فون پر ہیلو کیا۔ مختصر سا حال پوچھنے کے بعد پوچھا۔

''بولو فون کیسے کیا؟''

نبیلہ حیران رہ گئی کیا جواب دیتی۔ بولا ''بس ایسے ہی''۔

''ایسے ہی کیوں کچھ تو وجہ ہو گی۔''

نبیلہ کہہ اُٹھی ''نہیں ۔۔وہ۔۔بس۔۔ایسے ہی''

''اچھا ٹھیک ہے۔ خدا حافظ'' اتنا کہہ کر اسنے فون رکھ دیا۔ نبیلہ کا فون کٹ گیا اور فون کے ساتھ دل سے جڑی ہوئی سب تاریں کٹ گئی۔ یہ کیسا روکھا پن تھا اسکے لئے وہ بالکل بھی تیار نہیں تھی۔ وہ اسے کیا مانگتی تھی۔ صرف لمحہ بھر کی باتیں اور پل بھر کا ساتھ۔ وہ تو اسکو چھو بھی نہیں لیتی تھی اسکا دیدار ہی اسکے لئے کافی تھا وہ اسکو صرف دیکھنا چاہتی تھی۔

لیکن اب اسکی ایک بات ''خدا حافظ'' سے اس کی بولتی ہی بند ہو گئی۔

وہ دل ہی دل میں اپنے آپ سے پوچھ رہی ہے۔ ''یہ کیا ہو گیا'' وہ سوچتی رہی اور سوچتی رہی۔۔۔۔۔شاید۔۔

۔۔۔شاید اس کی بیوی اس کے سامنے تھی۔

☆☆☆

لاڈلا(۸)

ذرینہ چلارہی تھی اور سبوں نے سکوت اور خاموشی اختیار کی تھی۔۔۔۔،کوئی کچھ نہیں بول رہا تھا۔ پولیس والا بھی اسکے سامنے چپ سادھے کھڑا تھا۔ وہ ایک ایک شخص کے پاس جا کر اس سے سوال کرتی تھی لیکن کسی کے منہُ میں گویا زبان ہی نہیں تھی۔ سبھی چپ تھے لیکن آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ مگر کسی ایک فرد میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اسکے سامنے بولتے۔ کوئی جواب نہیں دے رہا تھا۔ نہ خود اسکی جرأت ہو رہی تھی کہ وہ لاش کے منہُ سے پردہ اُٹھاتی۔ وہ چلارہی تھی۔

''کون ہے یہ''

''کس کی لاش ہے یہ۔''

''کیوں لائے ہیں آپ لوگ اسے یہاں''

چپُ۔۔۔چپُ۔۔۔۔چپُ

''کون ہے یہ''۔

زرینہ چلائے جا رہی تھی۔اور روئے جا رہی تھی۔اور ایک ایک آدمی کے پاس جا رہی تھی۔گھر میں ایک ایک کر کے لوگ جمع ہونے لگے تھے۔ایسا لگتا تھا کہ اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔سب کی خاموشی اسے پاگل بنا رہی تھی۔

زرینہ ایک بہت ہائی فائی فیملی کی لڑکی تھی۔اسکی شادی بھی ایک ہائی فائی گھرانے میں ہوئی تھی۔اس کا سسرال بزنس کیپیشے سے تعلق رکھتا تھا۔اور وہاں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔کمی کی تو بات ہی نہیں۔ان کا بنگلہ سب عیش وآرام کی چیزوں سے بھرا تھا۔انکے یہاں ایک ہی بیٹا ہوا۔خوبصورت اور پیارا۔اور سب کا لاڈلا۔

اسکا نام انہوں نے کیا رکھدیا۔یہ تو کسی کو معلوم بھی نہیں۔شروع سے ہی اسکو لاڈو اور لاڈلا کے نام سے پکارتے تھے۔اسکی ہر فرمائش پوری کی جاتی تھی۔جو اسکے منہ سے نکلتا تھا وہ اسکے سامنے حاضر کیا جاتا تھا۔کھانے پینے کی کوئی چیز ہو یا کھیلنے کی کوئی چیز، پڑھنے لکھنے کی کوئی چیز ہو۔یا پھر کچھ اور۔یا پھر کمپیوٹر، سائیکل موٹر سائیکل یہ سب چیزیں تو وقت سے پہلے ہی آچکی تھیں کبھی اُس بات پر گفٹ تو کبھی اس بات پر گفٹ۔ گفٹ دینے کو تو بس بہانہ چاہئے تھا۔

رات کو اس نے دسویں کا رزلٹ سنا تھا۔اور وہ فسٹ ڈویژن میں پاس ہو گیا تھا۔نمبرات بھی اتنے زیادہ نہیں تھے کہ حضرت آدم پریشان ہو جاتا یا گھر والے اتنے خوش ہو جاتے۔بس اوسط درجے کے نمبرات تھے۔۔۔۔مگر وہ تب بھی گفٹ کا انتظار کر رہا تھا۔

''نہ جانے آج ممی پاپا نے میرے لئے کیا گفٹ رکھا ہوگا۔'' وہ رات بھر کروٹیں

بدلتا رہا۔ جہاں عام بچوں کو مہینوں کسی چیز کے لئے عاجزی کرنے پڑتی ہے وہاں یہ چیزیں اسکو وقت بے وقت گفٹ ملا کرتی تھی۔

''ش۔۔شاید گاڑی ، ہاں شاید۔۔کیونکہ اس دفعہ اب گاڑی ہی ہوسکتی ہے۔''اس نے اطمینان کی سانس لی۔

کیونکہ باقی اس کے پاس سب کچھ پہلے سے ہی آ چکا تھا۔

آٹھویں میں پاس ہونے پر اسکو یماہا ملا تھا۔اسی طرح اس سے پہلے کمپیوٹر، بڑا سائیکل، اس دفعہ تو گاڑی کے بغیر اور کیا ہوسکتا ہے۔۔۔۔۔

۔۔''مگر میں ابھی گاڑی کہاں چلا سکتا ہوں۔'؟

''۔۔میں تو اٹھارہ سال کا ہوا ہی نہیں ہوں۔۔''

''۔۔ابھی لائسنس بھی نہیں ہے۔۔''

''۔۔لائسنس کون دیگا۔ابھی میری عمر اتنی نہیں ہے۔''

''لیکن آج سے مجھے ٹیوشن جانا ہوگا۔۔۔ایک ٹیوشن سے دوسرے ٹیوشن، دوسرے سے تیسرے۔۔۔۔۔گاڑی کے بغیر کیسے ہوسکتا ہے؟۔باقی سب لڑکے بھی تو ٹیوشن پر کتنی بڑی بڑی گاڑیاں لاتے ہیں۔آہا۔۔آج مجھے بھی گاڑی مل جائے تو کیا۔۔۔۔۔۔''

رات گئے اسے نیند آئی۔صبح جاگا تو دیکھا ''مما پاپا'' کھانے کی میز پر اسکا انتظار کرر ہے تھے۔اور پاپا کے ہاتھوں میں ایک نئی چابی تھی جس کو پاپا اپنی انگلیوں میں گھما رہے تھے۔

لاڈو جب چائے پینے بیٹھا تو پاپا نے مما کی طرف اطمینان سے دیکھ کے چابیاں اس کی طرف بڑھائی۔

"It is for you sunny"اسکی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔اور اسنے خوش ہو کر کہا۔

"thanks mom.thanks papa i love you "

وہ چابی لیکر اتنا خوش ہوا کہ ناشتہ کرنا ہی بھول گیا۔وہ خوشی سے جھوم اٹھا اور مارے خوشی کے گھومنے چلا گیا۔

سارا دن اپنے دوستوں کے ساتھ گذارا۔اب شام بھی ہوگئی اور وہ لوٹا ہی نہیں۔

اب ماں باپ پریشان ہوگئے۔کہ بیٹا صبح کا گاڑی لیکر نکلا ہے ابھی تک گھر کیوں نہیں آیا۔

ماں سارا دن پریشان کبھی اپنی ماں کو فون کرتی کبھی بہن کو۔کبھی اپنے شوہر کو اور کبھی کسی اور کو۔کبھی گھر سے باہر جاتی اور کبھی اندر۔

''لاڈو اس سے پہلے بھی گھر سے باہر گھنٹوں نکلتا تھا۔مگر اپنے دوستوں کے ساتھ۔آج پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ آج اس نے گاڑی لی تھی۔'' ذرینہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کہہ رہی تھی۔

''میں بھی کیسی ماں ہوں۔لاڈو کے کسی دوست کا فون نمبر بھی تو نہیں ہے میرے پاس۔۔۔کس کو پوچھوں؟۔۔۔کہاں گیا؟۔۔۔۔کتنی دیر لگادی۔۔۔۔''

کچھ لوگ سفید کپڑے میں لپیٹ کر کچھ لے کر آئے اور انکے سامنے رکھ دیا اور اسکے ساتھ ساتھ بہت سے لوگ چپ سادھے کھڑے تھے۔آسمان کالے بادلوں کے سمندر میں ڈوب چکا تھا۔

(۹) نامحرم

اس کے دل میں ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ وہ بار بار اُٹھ کر کبھی دروازے کے پاس جاتی اور پھر واپس آتی۔ کبھی کھڑکی کا ایک پٹ کھول دیتی اور اپنے چھوٹے سے آنگن کو دیکھ لیتی۔ کبھی بجلی کا بٹن دباتی اور بجلی جلاتی اور کبھی اس کو بند کر دیتی۔ بے چینی تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی تو پاس بیٹھی لیلیٰ سے بوا کی یہ بے چینی دیکھی نہ گئی تو اس نے کہا۔

''بوا اسقدر کیوں بے چین ہو رہی ہو۔ میں بھی تو آپ کی بیٹی ہوں، میں تمہارا خیال رکھوں گی۔''

''میں جانتی ہوں بیٹا۔مگر اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں''۔بوا نے جواب دیا

''بُوا۔تم بالکل فکر نہ کرو۔اور میرے میاں بھی تو ہیں تمہارے پاس ۔ان کا احسان بھی تو تم کو نہیں لینا ہے،وہ تو تمہارا اپنا بچہ ہے۔ وہ تو ویسے بھی بیٹے کی طرح تمہارا خیال رکھتا ہے۔ہم دونوں ہیں نا تمہارے پاس۔''لیلیٰ نے کہا۔

بوا کی دونوں بیٹیاں،سارہ اور زارہ آج امریکہ چلی گئیں تھیں۔ان کے چلے جانے سے اس کی دنیا خالی ہوگئی تھی یوں تو اس کا بیٹا اور بہو بھی تو اسکے پاس تھے۔لیکن بیٹیوں کے جانے سے اس کے دل ایسا دھچکا لگا کہ سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔

'' بُوا، پلیز،۔ بھیا اور بھابھی کے بعد میں ہر وقت آپ کے پاس ہوں اور آپ کے ساتھ ہوں۔آپ کو جو ضرورت ہو، بلا جھجک مجھ سے کہیئے''۔لیلیٰ نے کہا۔

''ہاں میری جان اب یہی تو سہارا رہ گیا ہے اور کیا کرونگی؟تمہیں تو میرے انگ ہو۔تم لوگوں کے سوا میرا ہے ہی کون۔''بوا کی آنکھیں بھر آئیں۔وہ اپنی آنکھوں کی نمی کو لیلیٰ سے ان سے چھپانے کی ناکام کوشش کررہی تھی۔

بوا کو بیوہ ہوئے اتنے سال ہوئے تھے کہ اب یاد ہی نہیں تھا کہ کبھی سہاگن بھی تھی۔اس کی پوری دنیا دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔تینوں کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ بیٹا اور بہو تو ساتھ ہی تھے اور بیٹیاں ایک ہی گھر میں بیاہی گیئں دو بھائیوں کے ساتھ۔دونوں داماد امریکہ میں ڈاکٹر ہیں۔اور آج دونوں بیٹیاں بھی امریکہ جا چکی تھیں۔اماں کا اپنا بیٹا انجینیئر تھا اور بہو گھریلو عورت۔ بہو سارا دن گھر کے کاموں میں لگی رہتی تھی۔ایسا نہیں تھا کہ وہ اماں کا خیال نہیں رکھتی تھی مگر۔۔۔۔

سارہ اور زارہ کو گئے ہوئے بہت دن گذر گئے۔اماں اب قدرے صبر سے کام

لیتی تھی۔ لیلیٰ اکثر اپنی بُوا کے پاس آتی تھی۔ وہ بھی تو ایک گھریلو عورت تھی۔ اس لئے نہ نوکری کا جھنجٹ تھا، نہ گھر پہونچنے کی جلدی۔

وہ بُوا کے پاس گھنٹوں بیٹھتی تھی اور اس کا دل بہلاتی تھی۔ کبھی اس کے بالوں میں مہندی لگاتی تو کبھی تیل۔ کبھی اسکے کپڑے دھوتی۔ کبھی اس کو نہلاتی تو کبھی اسکے پاؤں دباتی۔ اس کے کمرے کی صفائی تو وہ روز کرتی تھی۔

لیلیٰ اگر کسی دن نہ آتی تو بوٗا کو فکر ہونے لگتی۔ کہ لیلیٰ کیوں نہیں آئی۔ لیلیٰ کا شوہر بھی ہر ہفتے میں ایک آدھ بار ضرور خالہ کو دیکھنے جاتا۔ وہ اپنی خالہ سے پوچھتا۔

''کسی چیز کی ضرورت تو نہیں''؟۔

''بازار سے کچھ لانا تو نہیں ہے خالہ؟''۔

اب تو بوٗا کی زندگی جیسے ان ہی پر منحصر ہوگئی۔ وہ اب خود کچھ کرتی نہیں تھی۔ گھر کا سارا کام بہو اور اس کا اپنا سارا کام لیلیٰ کرتی تھی۔ اس کے لبوں پر اب چوبیس گھنٹے لیلیٰ کا نام رہنے لگا۔ اور لیلیٰ بھی اپنی ماں کی طرح اس کی خدمت میں جٹ گئی۔

لیلیٰ کے سر سے ماں اور باپ کا سایہ بچپن میں ہی اُٹھ گیا تھا۔ اس کو بوٗا ہی ہمیشہ سے ماں کا پیار دیا ہے یا اس کی بڑی بہن اسکا خیال رکھتی تھی۔ اس کی شادی بھی بالکل سادگی کے ساتھ رشتہ میں کردی گئی اپنی دوسری پوبھی کے بیٹے کے ساتھ۔

سارہ اور زارہ اکثر امریکہ سے فون پر بات کرتیں تھیں۔ اماں کا حال پوچھتیں۔ اماں ان سے اکثر لیلیٰ کا ذکر کرتیں۔

''لیلیٰ آئی ہے اور میرے پاس بیٹھی ہے۔''

''آج لیلیٰ نے میرے کپڑے دھوئے۔''

''آج لیلیٰ نے مجھے نہلایا''

دن گذرتے گئے۔۔بوّا کا بیٹا ریٹائر ہو گیا۔بیٹیاں کبھی سال، دو سال کے بعد دس پندرہ دنوں وطن واپس آتیں تو میکے کا رُخ بھی کرتیں۔اور پھر سال بھر کی ساری محبت اپنی اماں پر لُٹا کے واپس چلی جاتی۔وہ آجاتیں۔اماں کا کام اپنے ہاتھوں سے کرتیں۔اماں کو بھی تسلی ہو جاتی۔

ان کے آنے کے بعد ان دنوں لیلیٰ اپنی بوّا کے پاس آنا جانا کم کر دیتی۔تا کہ بوا اپنی ساری توجہ اپنی بیٹیوں پر مبذول کرے۔مگر بوّا اس کو ڈھونڈتی رہتی تھی۔اور اس کی بلائیں لیتی تھی۔

وہ سب اکھٹے چائے پی رہے تھے اور سارا امریکی طرز زندگی پر تبصرہ کر رہی تھی۔

''یہ جو ہم یہاں تنہائی کا رونا روتے ہیں اس کا کوئی جواز ہی نہیں۔تنہائی کا احساس تو نیو یارک میں ہوتا ہے۔''

''بس نفسا نفسی کا عالم ہے'' زارا نے کہا

ان دونوں کی باتوں میں اماں بول اٹھی۔

''کیا لیلیٰ آج بھی نہیں آئی''۔

'اماں۔تمہیں تو ہم سے زیادہ لیلیٰ کی فکر رہتی ہے۔'' زارہ نے جھٹ سے بول دیا۔

دونوں بہنیں ماں کے لئے امریکہ سے تحفہ تحایف لیکر آئیں تھیں۔اس دن آسمان پر کالے بادل چھائے تھے۔انہوں نے سوٹ کیس سے خوبصورت ڈیزائنوں کے سوٹ، اور دیگر چیزیں پیش کیں تو اماں نے پوچھا۔

''لیلیٰ کے لئے کچھ نہیں لایا۔''

'' نہیں اماں اس کے لئے کیا لاتے'' سارہ نے اپنی ناک سکوڑتے ہوئے کہا۔

زارہ نے مداخلت کرتے ہوئے بولا۔'' ہم تو صرف اپنی ماں کے لئے چیزیں لاتے ہیں۔وہاں سے زیادہ چیزیں لا بھی تو نہیں سکتے ہیں''۔

اماں یہ سنکر چپ رہیں۔مگر وہ بد دل نہیں ہوئیں۔ چپ رہی۔اور دل ہی دل میں اپنے تحایف کو بانٹ کے رکھ دیا۔کہ ان میں سے کونسی چیز لیلیٰ کو دے گی۔بیٹیوں کی واپسی کے بعد وہ لیلیٰ کو کوئی قیمتی سوٹ، کوئی سینٹ کی بوتل، کوئی کریم کی شیشی دیتی۔اور بولتی۔'' لیلیٰ ان بہنوں نے یہ چیزیں تمہارے لئے لائی تھیں۔''

'' بوا۔اگر انہوں نے یہ چیزیں میرے لئے لائی تھیں تو مجھے خود کیوں نہیں دی۔'' لیلیٰ روٹھتے ہوئے انداز میں کہتی۔

'' لیلیٰ بیٹی۔انہوں نے مجھے یہ چیزیں دی ہیں تاکہ میں تمہیں خود دے دوں۔'' بُوا کے بہت اصرار پر تحفے تو لیتی تھی مگر دل ہی دل میں وہ جانتی تھی کہ یہ بوّا نے اپنی چیزوں میں سے نکال اس کو دئے ہیں۔

شام کے سائے دراز ہو رہے تھے کہ اچانک ماں کو دل کا دورہ پڑ گیا۔اسے جلدی سے ہسپتال پہونچایا گیا۔بیٹا، بہو، لیلیٰ، اس کا شوہر، رشتہ دار، بچے، بڑے، عورتیں، مرد سب جمع ہوگئے۔امریکا فون لگایا گیا۔اور اماں کی حالت سے ان کو آگاہ کیا گیا۔دونوں بیٹیاں فون پر ہی رونے لگیں۔ان کو کہا گیا کہ وہ ابھی نیشنل ہسپتال میں آئی، سی، یو میں ہے۔

امریکہ سے آنا اتنا آسان نہیں تھا۔تاہم انہوں نے ایمرجنسی میں اپنی ٹکٹیں خریدی اور چار دنوں کے بعد ان کو سرینگر پہونچنا تھا۔

لیلیٰ روئے جارہی تھی۔اس نے رو رو کر اپنا بُرا حال کر دیا تھا۔وہ سوچتی تھی کہ اگر بوا کو کچھ ہو گیا تو آج وہ سچ مچ یتیم ہو جائے گی۔آخر کار وہ دن آن پہونچا جب دونوں بیٹیاں اپنے دونوں شوہروں کے ساتھ اپنے گھر پہونچ گیئں۔اور آتے ہی پہلے انہوں نے ہسپتال کا رُخ کیا۔اور رات بھر وہیں رہیں۔رات بھر وہ آنسو بہاتی رہیں۔۔۔صبح ہوتے ہی اماں نے اس جہانِ فانی سے منہ موڑ لیا اور اپنی بیٹیوں سے کوئی بات کئے بغیر اور ان کو دیکھے بغیر لا الہ الا للہ پڑھ کر اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملیں۔

میت کو گھر لایا گیا۔اور کفن دفن کا انتظام کیا گیا۔جب میت کو غسل دینے کی باری آئی تو سارہ اور زارہ دونوں بہنیں اُٹھیں اور ان کے ساتھ غسل دینے والی ایک عورت بھی تھی۔لیلیٰ بے حال تھی۔اسے ایک رشتہ دار عورت نے کہا۔"لیلیٰ۔تم نے اپنی پوپھی کی اتنی خدمت کی ہے۔،جاؤ پانی کا ایک لوٹا تم بھی ڈالو۔اس کے بدن میں ٹھنڈ پڑے گی۔ وہ تم سے کتنا پیار کرتی تھی۔تم ہی تو۔۔۔۔۔"

لیلیٰ جلدی جلدی اُٹھی اور وضو کیا اس کو غسل دینے کے لئے گئی۔مگر انہوں نے دروازہ اندر سے بند کیا تھا۔اس نے دروازہ کھٹکھٹایا"آپا دروازہ کھولو۔میں بوا کو آخری بار دیکھنا چاہتی ہوں۔اس کو پانی کا ایک لوٹا ڈالنا چاہتی ہوں"۔

سارہ نے دروازہ کھولا،اور کہا۔

"نہیں ہم اس کی دو بیٹیاں ہیں۔اس کا غسل صرف ہم پر ہی واجب ہے۔آپ سب اس کے لئے نامحرم ہیں۔عورتیں بھی ایک دوسرے کے لئے نامحرم ہوتی ہیں۔"

''لیکن آپا میں آخری بار۔۔۔۔'' لیلیٰ کی بات گلے میں ہی پھنس گئی۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں لیلیٰ تم اسکو پانی نہیں ڈال سکتی۔۔۔۔'' انہوں نے اندر سے دروازہ اندر سے بند کیا۔

لیلیٰ زور زور سے رونا چاہتی تھی لیکن اس کے ہونٹ ساکت تھے۔عورتیں بھی اب خاموش ہو چکی تھیں۔وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی' مگر اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔

☆☆☆

(۱۰) بدلتی نظریں

''میرا خواب ہے کہ میں ان بچوں کو خوب پڑھاؤں اور ڈاکٹر بناؤں، انجینئر بناؤں، وکیل بناؤں۔ یہ میری دلی تمنّا ہے۔''

غلام محمد نے اپنی بیوی سے کہا۔

''خدا کرے تمہاری مراد پوری ہو جائے۔'' اس کی بیوی سکینہ نے بھی بڑی نرمی سے جواب دیا۔

''میں زندگی میں بہت محنت مزدوری کروں گا مگر اپنے بچوں کو پڑھا لکھا کر اچھا انسان بناؤں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ میری طرح چھوٹے ملازم اور تمہاری طرح ان پڑھ رہیں۔''

''ہاں بالکل صحیح ہے ایسا ہی ہونا چاہئے۔'' اسکی بیوی سکینہ نے حامی بھری۔

غلام محمد ماں کا تیسرا بیٹا تھا۔ اور اس کی شادی کو ہوئے ابھی صرف آٹھ سال ہو چکے تھے اور ان آٹھ سالوں میں اسنے پانچ بچے پیدا کر لئے تھے۔ سب کے سب چھوٹے۔

ایک دوسرے سے صرف ایک یا ڈیڑھ سال کا فرق تھا۔مشکل سے بڑے دو بچے سکول جاتے تھے۔اور تیسرے کو ابھی ابھی سکول میں داخل کیا گیا ہے۔اس کی بیوی ان پڑھ تھی۔ان کے گھر کے ساتھ گھریلو پہچان اور تعلقات ہونے کی وجہ سے سکینہ کے ساتھ اس کی شادی کی گئی تھی۔وہ بہت نرم مزاج تھی اور ایک بات تو اسمیں ضرور تھی کہ اپنے شوہر اور اپنے بچوں کا خیال رکھتی تھی۔اور اس کے علاوہ غلام محمد کے والدین کا بھی خیال رکھتی تھی۔ ان کے لئے کھانا بناتی، گھر کا سارا کام کرتی۔غلام محمد کی غیر حاضری میں بچوں کی دیکھ بال کرتی۔ان کو سکول لے جاتی۔واپس لاتی اور روزمرہ کا سارا کام نپٹا دیتی۔

مگر کبھی کبھی جب کوئی اسے ڈانٹتا تھا تو اس کو اس قدر طیش آتا تھا کہ سارا دن برتنوں، کھڑکیوں، دروازوں کی آوازیں اتنی زور زور سے آتی تھیں کہ سننے والا خود ہی سمجھ جاتا تھا کہ کسی نے اسے ڈانٹ دیا ہے۔

غلام محمد بڑے دنوں سے پیٹ درد کی شکایت کر رہا تھا۔پیٹ کا درد دکھاتے دکھاتے ایک ڈاکٹر سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے، کبھی سونوگرافی، کبھی یہ ٹیسٹ، تو کبھی وہ ٹیسٹ کرتا گیا مگر اصلی بیماری معلوم ہی نہ ہوسکی۔

آخر کار سکین (Scan) کرایا گیا۔معلوم ہوا کہ اندر سے کوئی خرابی ہے۔اور وہ خرابی بڑی خطرناک صورت اختیار کرگئی ہے۔

بے چارہ غلام محمد، چھوٹا سا ملازم۔وہ اپنی بیوی بچوں کا پیٹ اسی پیسے سے پالتا تھا جو اس کو تنخواہ ملتی تھی۔چھوٹے ملازم کی تنخواہ بھی کتنی ہوتی ہے۔اور اس پر روزانہ کے خرچے۔اور اس پر بچوں کی فیس۔

مگر اب اچانک پیٹ کی خرابی کی خبر سنکر دلّی دوڑ پڑا۔اور آخر کار وہی نکلا جس کا

ڈر تھا۔یعنی کینسر۔

ایک طرف مفلسی اور ناداری دوسری طرف سے یہ مہلک بیماری۔ایک طرف مہنگی دوائیاں اور دوسری طرف بچوں کی فیس ۔ان دونوں سے کیسے ایک ساتھ نمٹا جائے۔ایک طرف چھوٹے چھوٹے بچے اور دوسری طرف سے بیوی۔کیا ہوگا کیسے کر پائے گا۔وہ اپنے دماغ کا توازن نہیں رکھ پا رہا تھا۔تھا۔

وہ اور اسکی بیوی دلّی دوڑ پڑے۔دہلی والوں نے تھرپی کا علاج معالجہ شروع کیا اور دفتر والوں نے روپیہ پیسہ اکھٹا کر کے امداد کیا۔ڈاکٹروں نے چھ تھرپی دینے کو کہا۔اور ہر دو تھرپیوں کے بیچ میں ایک مہینے کا وقفہ تھا۔وہ یہ وقت اپنی بیوی اور بچوں اور اپنے والدین کے ساتھ گذارنا چاہتا تھا۔دوسری بار کی تھرپی کے وقت اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

''میں جب تک دلی سے واپس آؤنگا تم اماں ابا کا خیال رکھنا۔''

''مگر میں تمہارے ماں باپ کے ساتھ کیوں بیٹھوں۔کیوں ان کو بنا بنا کے کھلاؤں۔اس سے تو اچھا ہے کہ میں اپنے میکے چلی جاؤں۔''اس نے جیسے نادانی سے کہا۔

لیکن غلام محمد نے اس کو بڑی ہمدردی اور عاجزانہ لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

''میری غیر حاضری میں تم میرے والدین کا خیال رکھوگی۔تو وہ بھی تمہارا اور بچوں کا خیال رکھیں گے۔میں بھی چین اور سکون سے اپنا علاج کرا سکوں گا۔''

مگر وہ کسی کی بات ماننے والوں میں سے کہاں تھی۔اور اس نے میکے کا رخ کر لیا۔دو بیٹوں کو اپنے ساتھ لے گئی اور تین بیٹیوں کو اس کے ماں باپ کے پاس چھوڑ دیا۔غلام محمد چلا گیا اور اس کو ماں باپ نے جانے سے پہلے سمجھا دیا تھا کہ بہو اگر جانا چاہتی

ہے تو وہ چلی جائے۔ہم ابھی زندہ ہیں ہم تمہارے بچوں کا خیال رکھیں گے۔۔۔تم اپنی صحت کی فکر کرو۔جان ہے تو جہان ہے۔

جوں توں غلام محمد پھر دہلی چلا گیا۔اب کی بار اسکی دوسری تھرپی تھی۔پھر سے دفتر والوں نے ،رشتہ داروں نے کچھ کچھ رقم جمع کر لی اور خود بھی اسنے کچھ رقم جمع کی تھی جو اس بُرے وقت میں کام آئی۔اور ایک مہینے کے وقفے میں وہ لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کرنے لگا تھا جس سے وہ اور کچھ پیسے اکٹھا کرتا تھا۔اور اپنا کام چلانے کی کوشش کرتا تھا۔

سکینہ کا تو جیسے دماغ ہی خراب ہو گیا تھا۔اس کو ہر بار لگتا تھا کہ اب کی بار وہ مر کر ہی آئے گا۔اور اب اس کی لاش ہی دیکھنے کو ملے گی۔وہ ہر بار اپنے دماغ میں یہ سوچتی تھی کہ اگر غلام محمد مرے گا تو وہ کیا کرے گی؟نہ تو اسکی جگہ پر اس کو نوکری مل سکتی ہے اور نہ کچھ اور۔وہ تو اَن پڑھ ہے مگر ہر وقت حساب لگاتی تھی کہ اس کو کتنا پیسہ ملے گا۔اسی لئے وہ اس کے جیتے جی کچھ کام کرنا چاہتی تھی۔اس کے جی پی فنڈ سے ملنے والی رقم کا حساب، دفتر سے ملنے والی رقم اور بھی بہت چیزوں کی آس لگائے بیٹھی تھی۔

غلام محمد جب تھرپی کے بعد واپس آیا تو سکینہ بھی میکے سے دوڑتی ہوئی آئی۔بولی ''شکر ہے کہ تم اس بار بھی بچ کر آ گئے۔شاید اسی لئے کہ میرا کام کر سکو۔''

غلام محمد حیرانگی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔اس کو سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس کی بیوی یہ آج کس قسم کی بات کر رہی ہے۔اس کو یہ کیا ہو گیا ہے۔

''تمہارا کونسا کام''۔اس کے ابا نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''اسے چاہیے کہ میرا کچھ چارہ کر لے۔میں پانچ یتیم بچوں کو لیکر کہاں جاؤں گی۔''

ابّا کو غصہ آیا اور اس نے بہو کو ڈانٹ کر کہا۔

''بہوابھی تو میرا بیٹا زندہ ہے۔تم ان بچوں کو یتیم کیوں کہتی ہو۔'' ابا کو یہ بات برداشت نہیں ہوئی۔وہ اٹھ کر چلا گیا۔اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔اور ہونٹوں تلے کہہ رہا تھا۔

''جگر جگر است و دِگر دِگر است''۔

ماں تلملا کے بول اٹھی۔''تم کیا چاہتی ہو۔یہ کیا کرے۔پیسہ پیسہ بٹور رہا ہے تا کہ موت سے اپنی زندگی واپس لے لے۔تو کس چارے کی بات کر رہی ہے۔یہ تمہارا ہی تو چارہ ہے۔یہ ٹھیک ہو جائے گا انشااللہ۔پھر سب کچھ تمہارا ہی ہے۔اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

مگر غلام محمد ابھی بھی چپ چاپ انکی باتیں سُن رہا تھا۔اس کا سارا جسم جیسے سُن ہو گیا تھا۔ سکینہ جو اتنی اچھی بیوی تھی اسکو کیا ہو گیا ہے۔وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ غصہ سے سکینہ اٹھ کھڑی ہوگئی۔اور زور زور سے چلانے لگی۔

''سب سے پہلے اسے اپنا مکان بنانا پڑے گا۔کل کو میں کہاں جاؤں گی۔سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے مکان بنانے کی سوچو۔اس کے بعد دوسری چیزیں۔ایک کمرہ دو کمرے۔ رہنے کے لئے کچھ تو الگ ہونا چاہئے۔کیا کروں گی میں۔کیسے گذارہ کروں گی۔ایک دو بچے نہیں۔پانچ بچے ہیں۔اتنے بچوں کو لیکر باپ کے گھر کیسے جاؤں گی۔''؟

''تم سارے پیسے اپنی جان کے پیچھے لگا رہے ہو''۔بیوی نے اور بھی غصہ بھرے لہجے میں غلام محمد سے بولا۔

مگر غلام محمد ابھی بھی حیرانگی میں اپنی بیوی کو دیکھ رہا تھا۔وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ ''سکینہ ہمیشہ سے ایسی تو نہ تھی۔تھوڑی سی نادان اور تھوڑی سی غصہ والی تو تھی۔مگر پیار اور

محبت کی کمی بھی اس میں نہیں تھی۔ میری تو بات ہی نہیں، وہ تو دوسروں کا خیال بھی رکھتی تھی۔ مگر آج جو باتیں وہ کر رہی ہے وہ نادانی کی نہیں، بلکہ جیسے سیکھ سکھائی ہوئی باتیں ہیں جو یہ فرفر بولے جا رہی ہے۔ اس کو مکان کی ابھی کیا پڑی ہے۔" اس نے بڑی نرمی سے سکینہ کو کہا۔

"دیکھو جب جان بچے گی تبھی تو مکان بن جائیں گے۔ پہلے صحت ہے اور بعد میں سب کچھ ہے۔ صحت سے ہی زندگی کی ساری خوشیاں ہیں اور صحت سے ہی مکان اور گھر ہوتے ہیں۔"

سکینہ نے اور بھی غصہ سے کہا۔ "ہاں یہ سب ٹھیک ہے۔ مگر ۔۔ میرا بھی تو سوچ لو۔۔ رہنے کے لئے گھر نہ ہوگا تو کیا کروں گی۔۔ بچوں کے لئے۔۔۔ ۔ مجھے معلوم ہے کہ ساس سُسر اپنی بہو کے ساتھ پھر کیا کرتے ہیں۔ وہ بہو کو بچوں کے ساتھ گھر سے نکال دیتے ہیں۔ اور خدا کے سہارے چھوڑ دیتے ہیں۔ میں نے بھی اب دنیا دیکھی ہے۔۔۔۔۔۔"

ماں نے خون کا گھونٹ پی لیا۔ مگر جانے کیسے چپ رہی۔ نہ بیٹے سے کچھ بول سکی اور نہ ہی بہو سے کچھ کہا۔ چپکے سے وہاں سے اٹھی اور چل پڑی۔

سکینہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی "مکان ۔۔۔ گھر۔۔۔ کمرے۔۔۔ رہائش کا سامان۔۔ دکان۔۔۔۔ نوکری۔۔ جانے کیا کیا۔۔۔ تنخواہ۔۔۔ پیسے۔۔ جی پی فنڈ۔" وہ چلائے جا رہی تھی۔ لیکن اب کوئی کچھ نہیں بول رہا تھا۔ سب چپ تھے۔ غلام محمد اسکے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور کچھ سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

(۱۱) آگ

لوگ ایک طرف سے دوسری طرف دوڑ رہے تھے۔کوئی ہاتھ میں کپڑے کی گٹھری اٹھائے ،کوئی ہاتھ میں کمبل اٹھائے ،کوئی زیور،کوئی پرس،کوئی بیگ،اور ہرکوئی الگ الگ چیزیں اٹھا رہے تھے،کوئی اپنے چھوٹے بچے کو اٹھا رہا تھا۔سب چلا رہے تھے،ہرطرف سے چلانے کی آوازیں زورزور سے آرہی تھیں۔

''خدارا مجھے بچاؤ۔میری بیٹی کی شادی ہونے والی ہے۔جہیز کا سارا سامان پڑا ہوا ہے۔میری بیٹی کا سارا سامان جل جائے گا۔خدا کے لئے کوئی مجھے بچاؤ۔'' سامنے کے گھر سے سارہ آنٹی بار بار چیخ رہی تھی۔

محلے کے لڑکے دوڑ دوڑ کر اس کی طرف جا رہے تھے۔کوئی اس کے کمرے تک پہنچ گیا۔اور اس نے جہیز اور شادی کے کپڑے کھڑکی سے پھینکنا شروع کیا۔اور وہ سارے کپڑے کسی کی محفوظ چھت پر ڈھیر ہو رہے تھے۔

آنٹی نے سُکھ کی سانس لی۔کہ اگر مکان کا کچھ حصہ جل بھی رہا ہے تو کم از کم اس کی بیٹی شاہانہ کی شادی کے کپڑے تو بچ گئے جو بڑی مشکل سے اب درزی سے بن کر بھی آگئے تھے۔سونا چاندی تو پہلے سے بنک کے لاکر میں رکھا ہے۔ایسی گھنی آبادی میں کس کس کا مکان بچ جائے گا؟ یہ آگ کہاں سے آئی۔؟ کہاں سے شروع ہوئی۔؟ کس گھر میں پہلے لگی۔؟ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔آگ گیس سے لگی یا بجلی کی وجہ سے کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

لوگوں کا ایک مجمع جمع ہو گیا تھا۔بچاؤ کرنے والے کم اور تماشہ گیر زیادہ تھے۔حیدر صاحب بھی دوڑے دوڑے آئے اور اپنے ہاتھ میں پوٹلی سنبھالے مجمع کے بیچ میں آگئے۔اس نے غلام نبی کو دیکھا تو خوش ہو کر کہا۔

''بھائی میرے، یہ پوٹلی تم سنبھالو۔اس میں سونے کی چیزیں ہیں۔میں کسی ایسے شخص کو ہی ڈھونڈ رہا تھا جس کے ہاتھ میں میں اپنی پوٹلی امانت کے طور رکھ دوں۔اس بھاگم دوڑ میں کہاں رکھوں۔پلیز اس پوٹلی کو اپنے پاس رکھو۔''

''کوئی بات نہیں میں رکھ لوں گا''۔غلام نبی نے یہ کہہ کر، پوٹلی بنا کھولے اپنے پھرن کی جیب میں ڈال دی۔

آگ اپنے پورے زوروں پر تھی۔اور ادھر سے ہوا نے بھی اپنے زور دکھانا شروع کیا۔دونوں میں جنگ شروع ہو گئی۔کہیں آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے اور کہیں ہوا اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا رہی تھی۔دیکھتے ہی دیکھتے کتنی ہی دکانیں اور کتنے

مکان اس کی گرفت میں آئے۔ چیخنے اور چلانے کی آوازیں بدستور آرہی تھیں اور بچوں کی خوف اور گھبراہٹ سے ملی جلی آوازیں بھی آرہی تھی۔

آگ پر قابو پانے کی کوشش جاری تھی۔ فائر بریگیڈ والے بھی اپنی کوشش میں لگے تھے۔ مگر ہوتے ہوتے شام ہونے لگی۔ لوگ اس انتظار میں تھے کہ کہیں کوئی جانی نقصان نہ ہو۔ مگر جن لوگوں کے گھر جل گئے وہ سڑکوں پر آ گئے۔ ان کو رہنے کے لئے نہ گھر تھا اور نہ ہی کھانے کے لئے کوئی چیز۔

وہ سڑکوں پر بیٹھے رو رہے تھے۔ سارے محلے والے اپنے اپنے گھروں میں دو دو چار چار لوگوں کو لے گئے تا کہ اب رات گذار سکیں۔

حیدر صاحب اور اسکی بیوی اور اس کا بیٹا بھی مجمع میں تھا۔ اور ان کو بھی کوئی ہمسایہ گھر والا اپنے گھر لے گیا۔

''مگر حیدر صاحب آپ کی بہو کہاں ہے۔؟'' اس گھر والے نے اس سے پوچھا۔

پھر اس کی بیوی سے بھی پوچھا۔ ''بھابھی آپ کی بہو کہاں ہے۔''؟

مگر کسی نے کچھ جواب نہ دیا وہ تینوں ایک دوسرے کی طرف چور نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے کسی نے ان کی چوری کو پکڑ لیا ہو۔ اس کی بیوی ایکدم بول اٹھی۔

''بھائی صاحب جب سے آگ نمودار ہوئی بہت تلاش کیا اس کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ شاید۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔۔ چلو ایک بار پھر اس کو ڈھونڈ لیتے ہیں۔''

بہو کو ڈھونڈ نے سب لوگ چلے گئے۔ مگر رات کا اندھیرا چھا گیا تھا اور سردی نے بھی اپنا ایسا جال بچھایا تھا کہ اب کسی میں اتنی طاقت ہی نہ تھی کہ رات بھر اس کو کوئی ڈھونڈتا رہے۔ ابھی

بھی جلتے مکانوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

صبح جب سورج کی پہلی کرن زمین پر پڑی تو وہ لوگ جلدی جلدی سے ہمسایوں کے گھر سے نکل پڑے۔ لوگوں کا مجمع پھر سے جمع ہو گیا۔ ایک شور اٹھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

''حیدر صاحب کی بہو رات سے غائب ہے۔''

''ذرا چل کر ان کا گھر دیکھتے ہیں۔''

کچھ لوگ رات کی چھوڑی ہوئی چیزیں ڈھونڈ رہے تھے۔ سارہ آنٹی اس گھر کی چھت پر اپنی بیٹی کی چیزیں ڈھونڈ رہی تھیں۔ مگر اس کی بیٹی کے جہیز کے کپڑے اس کو نہیں مل رہے تھے۔ اس کا مکان آگ کی لپیٹ سے بچ گیا تھا۔ مگر اس کے سارے کپڑے کہیں مل نہیں رہے تھے۔

حیدر صاحب پہلے اپنے زیورات کی پوٹلی لینے کے لئے غلام نبی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ لوگوں کی اس قدر بھیڑ لگی تھی کہ کہیں کسی کو کوئی مل ہی نہیں رہا تھا۔ کچھ لوگ کھانا، کپڑے، بنیانیں، پھرن، جیکٹ، وغیرہ لیکر آئے تھے۔ اور کچھ لوگ چاول، دالیں اور آٹا لیکر آرہے تھے۔ ہر کوئی ایک دوسرے کی مدد کرنے کو آگے آگے آرہا تھا مگر۔۔۔ حیدر صاحب کو غلام نبی نہیں مل رہا تھا۔ وہ اس کو ہر جگہ ڈھونڈ رہا تھا۔ آخر مجمع میں اس کی نظر غلام نبی پر پڑ ہی گئی اور حیدر صاحب نے اسے زور سے آواز لگائی۔

''میاں غلام نبی میری پوٹلی تو دینا ذرا''۔

''پوٹلی؟ کونسی پوٹلی؟

''میاں یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ میں نے جو پوٹلی آپ کو امانتاً دی تھی۔ میرے کُل زیورات کی پوٹلی، کم سے کم تین لاکھ کا سونا''۔

''سونا، زیورات، پوٹلی، ۔۔۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا ہے۔تم کس پوٹلی کی بات کرتے ہو۔''

غلام نبی نے انجان بننے کی ایکٹنگ کی۔اور حیدر صاحب دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔اس کی آنکھیں بھر آئیں اوراس نے لوگوں کی طرف مڑ کر کہا۔

''ارے لوگو۔تم سب کے سامنے ہی تو میں نے اس کو زیورات کی پوٹلی دی تھی جواس نے پھرن کی جیب میں رکھی تھی۔''ذرا میرے بھائی پھرن کی جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھو کہیں بھول تو نہیں گئے۔''

غلام نبی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر جیب کو ٹٹولا۔اور جیب کا اندرونی حصہ باہر نکالا اور ساتھ ہی کہا۔شاید آگ کی وجہ سے تمہارے دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔اسی لئے ادھر کا اُدھر بول رہے ہو۔''

حیدر صاحب نے اپنے ماتھے پر ہاتھ دے مارا اور بنا کچھ کہے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔مگر لوگوں کا ہجوم وہی تو نہیں تھا جو ایکدن پہلے تھا۔سب خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔

حیدر صاحب بھی اب اپنی بہو کو ڈھونڈنے چلے تھے۔اس کے ساتھ ساتھ محلے کے بہت سارے لوگ بھی جا رہے تھے۔حیدر صاحب دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔

''یہ بھی گیا اور وہ بھی''۔

اس کی بیوی چھاتی پیٹتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

''اللہ میری بہو کو صحیح سلامت رکھنا، معلوم نہیں کل سے کہاں گئی ہوگی۔اس کا کہیں پتہ نہیں۔''

اس کے گھر پہونچ کر لوگوں نے سارے کمروں میں دیکھا جو بہت زیادہ جلے

ہوئے نہیں تھے۔ مگر کچن کے پاس پہنچ کر رُک گئے دروازے پر تو تالا لگا ہوا تھا۔؟ دروازہ باہر سے بند کیوں؟ لوگوں نے دروازہ اور تالا دونوں توڑ دیئے اور اندر چلے گئے۔ حیدر صاحب کی بہو کی جلی ہوئی لاش دروازے کے ساتھ ہی پڑی تھی۔ جس سے لگ رہا تھا کہ اس نے دروازہ کھولنے کی بہت کوشش کی ہے۔ جس کو باہر سے تالا لگایا گیا تھا۔

☆☆☆

(۱۲) ڈھائی سو

''یہ لیبا۔۔ٹری۔۔۔کھلی ہے۔''؟

مُرجھائی ہوئی عورت نے تھکی تھکی آواز میں پوچھا۔اور دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

اندر سے ایک آدمی نے لیبارٹری کا دروازہ کھولا اور کہا۔

''ہاں ہاں۔ یہ لیبارٹری کھلی ہے۔اندر آجاؤ۔''

''مجھے یہ ٹیسٹ کرنا ہے۔'' اپنے بیگ میں سے ڈاکٹر کا نسخہ نکالتے ہوئے اس نے کہا۔

"FNAC۔۔''لڑکے نے بڑی حیرانگی سے نسخہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''مگر وہ ڈاکٹر تو چلا گیا۔جو یہ ٹیسٹ کرتا ہے۔۔''پھر کچھ سوچ کر اس نے دوبارہ بولا۔''تم ایسا کرو شام ساڑھے چار بجے آؤ۔ہم تمہارا ٹیسٹ کردیں گے۔''

''شام ساڑھے چار بجے؟ بیٹا ابھی تو صبح ہی ہے۔''عورت حیرانگی سے بولی۔

''ابھی کیا بجا ہے، بیٹے''اس نے دوبارہ اس لڑکے سے پوچھا۔

''اس وقت گیارہ بجے ہیں''۔

''گیارہ، بارہ، ایک، دو، تین، چار''اس نے اپنی انگلیوں پر گھنٹوں کا حساب لگا کر کہا۔

''کیا پورے پانچ گھنٹے انتظار کرنا پڑے گا۔'؟'

لڑکے نے بے جھجک جواب دیا۔''انتظار کرنے کو کس نے کہا۔شام کو چار بجے آجاؤ۔''

''ارے بیٹا۔ میں بہت دور سے آئی ہوں۔دوبارہ کیسے آونگی۔''

''کہاں سے آئی ہو''لڑکے نے تنگ آکر پوچھا۔

''گاندربل سے۔صبح سویرے کی گاڑی سے ڈاکٹر سے ملنے آئی ہوں۔ڈاکٹر نے ٹیسٹ کرنے کو کہا۔اور وہ بھی آپ کی دُکان سے۔اب میں یہاں ہی بیٹھوں گی اور ٹیسٹ کر کے ہی جاؤنگی۔''

یہ دوکان اس بلڈنگ کی دوسری منزل پر تھی۔اس کے سامنے ہی ایک بینچ لگا ہوا تھا وہ اُسی پر بیٹھ گئی۔

یہ گاندربل کی''چاندنی''تھی۔اس کا شوہر گاؤں میں ہی مزدوری کرتا تھا۔اس کے پانچ بچے تھے۔جو ایک سے بڑھ کر ایک شرارت کرتے تھے۔چاندنی بہت دنوں سے بخار میں تپ رہی تھی۔کبھی بخار اترتا تو مارے سردی کے دانت ٹھٹھر جاتے۔سردی کم ہوجاتی تو بخار کی آگ محسوس ہوتی۔مگر گھر میں ڈاکٹر کے پاس جانے کی فرصت نہیں۔کبھی فرصت ہے تو ڈاکٹر کے پاس جانے کی سہولیت نہیں۔جب پندرہ دنوں تک روز ایسا ہی ہوتا رہا تو ڈاکٹر کے پاس جانا ہی پڑا۔وہ ڈاکٹر ہر اتوار کو گاندربل مریضوں کو دیکھنے جاتا تھا۔اسی ڈاکٹر نے تشخیص کے بعد کچھ ٹیسٹ کرنے کو کہا۔مگر ٹیسٹ شہر جا کر ہی کرنے تھے۔شہر جانے کے لئے اگر اس کا شوہر اس کے ساتھ جاتا تو بچوں کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔اس وجہ سے چاندنی اکیلی چلی گئی۔

بارہ۔پھر ایک، پھر دو بھی بج گئے۔مگر یہ عورت وہاں سے ہلی بھی نہیں۔پھر تین

اور پھر چار بھی بج گئے۔ بار بار آتے جاتے لوگوں سے پوچھتی رہی۔'' بیٹا وقت کتنا ہوا،''اور دل ہی دل میں حساب لگاتی۔ کہ اب کتنے گھنٹے رہ گئے۔ جب سُنا کہ چار بج گئے۔ تو دوبارہ لیبارٹری کے دروازے پر دستک دی۔

''ڈاکٹر صاحب آ گئے کیا۔''

''نہیں ابھی نہیں''۔ اندر سے آواز آئی۔

پانچ بجے ڈاکٹر آیا تو یہ لڑکا فوراً اس عورت کو بلانے گیا اور کہا۔

''آیئے۔ ڈاکٹر صاحب آ گئے۔''

عورت لیبارٹری کے اندر چلی گئی۔ وہاں بیٹھے ہوئے ایک اور لڑکے نے بلایا۔

''آپ پہلے یہاں پر ٹیسٹ کے پیسے جمع کر لیجئے۔ پھر اندر جایئے۔''

''پیسے؟''حیرانگی سے جیسے عورت نے پوچھا۔

''ہاں''لڑکے نے بتا دیا۔

''کتنا''حیرانگی سے ہی پوچھا۔

''ڈھائی سو روپئے۔''

''ڈھائی ۔۔سو ۔۔روپئے ۔۔۔صرف ۔ٹیسٹ ۔۔کے ۔لئے۔''وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔

''میرے پاس صرف پچاس روپئے ہیں۔ اور میں نے دن میں بھی کچھ نہیں کھایا ہے۔ بھوک سے بھی بُرا حال ہے۔ ٹیسٹ کے بعد گاؤں بھی پہونچنا ہے۔۔ دیر لگی تو رات شہر میں گذارنی پڑے گی۔۔۔ ڈھائی سو روپئے۔۔ کہاں سے لاؤں گی۔۔ ڈھائی سو روپئے۔۔۔''

سوچ اور فکر اس کے چہرے پر عیاں تھے۔ وہ بڑبڑانے لگی۔

سورج بھی اب ڈوبنے کی تیاری میں لگ چکا تھا۔

''ڈھائی سو روپئے۔۔۔ سارا دن میں نے انتظار میں گذارا۔۔۔ مگر کسی نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ اس میں ڈھائی سو روپئے لگیں گے۔ کہاں سے لاؤں گی۔۔۔ ڈھائی سو۔۔۔ روپئے''۔

اور وہ بے خودی میں اس بڑبڑاہٹ میں سیڑھیاں اترنے لگی۔ چکرآ گیا اور سیڑھیوں سے گر گئی۔ سر کو چوٹ لگ گئی۔ خون زوروں سے بہنے لگا۔ اور اتنے میں ہی بے ہوشی چھا گئی۔

''کون ہے یہ، بھئی کوئی اس کے ساتھ ہے۔؟'' کسی شخص نے آواز دی۔

''ارے، اس کو کوئی ہسپتال لے جاؤ'' کسی اور شخص نے کہا۔

ایک مجمع جمع ہو گیا۔ اور مجمع میں سے کوئی کچھ بولتا ہے اور کوئی کچھ۔

''لگتا ہے کہ اس کی جان میں جان ہی نہیں ہے۔''

کسی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس روپئے کا نوٹ نکالا۔ اور اس کے پاس ڈال دیا۔ اب کس بات کی دیر تھی سب لوگوں نے اپنی اپنی جیبوں سے پیسے نکالے اور اس کو ڈالتے گئے۔ یہاں تک کہ روپیوں کا ایک ڈھیر جمع ہو گیا۔ مگر اس کو ہوش نہ آیا۔

یہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ اور کس لئے آئی تھی؟ کسی کو معلوم نہ تھا۔

سورج بھی اب ڈھل چکا تھا۔۔۔

(۱۳) بھیک

سورج بڑی مشکل سے آسمان پر نکل رہا تھا۔ جیسے اس پر کوئی زبردستی ہو رہی تھی۔ جیسے ابر اور بادل اسے باہر آنے نہیں دے رہے تھے۔ سردی کی ایک لہر بھی چل رہی تھی۔ سورج میں جیسے گرمی باقی ہی نہیں رہی تھی۔

وہ تین بچوں کو لیکر سڑک کے کنارے بیٹھی تھی۔ ایک بچہ گود میں لئے تھی جو بہت ہی بے قرار تھا اور بار بار اسکی گود سے اترنے کی کوشش کر رہا تھا، اور باقی دو بچوں کو اپنے دائیں اور بائیں جانب بٹھایا تھا۔ دور سے جب اس پر نظر پڑتی تھی تو ایسا لگتا تھا کہ بھیک مانگ رہی تھی۔ مگر جب سامنے سے گذر جاتے تو معلوم پڑتا تھا کہ وہ تو بھیک مانگ ہی نہیں رہی تھی۔ وہ تو بس خاموشی سے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں بالکل خالی تھیں۔ ان میں نہ کوئی چاہت، نہ زندگی، نہ جینے کی ہوس، نہ خوشی کی آرزو، نہ کچھ کہنے کی سکت، اور نہ

میں بھی جب اس سڑک کے کنارے پہونچی تو میری نظر ان تینوں بچوں اور اس

عورت پر پڑی۔اور میں بھی بے خیالی میں اسی کی طرف اپنے قدم اٹھا رہی تھی۔آہستہ آہستہ میں بھی اس کے پاس پہونچی تو دیکھا کہ وہ عورت بِنا کچھ کہے لوگوں سے بہت کچھ کہہ رہی تھی۔اس کی حالت زار ہی اس کی آواز تھی اور لگ رہا تھا کہ اس نے بہت دنوں سے نہ خود پیٹ بھر کر کھایا ہے اور نہ ہی اپنے بچوں کو پیٹ بھر کھلایا ہے۔

میں اس کے اور قریب گئی۔تو مجھے اس کا چہرہ جانا پہچانا لگا۔میں اس کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔مگر قطعی میرے ذہن میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ میں اس عورت کو کیسے جانتی ہوں؟ میں نے اس عورت کو کہاں دیکھا ہے۔؟ اپنے ذہن پر جتنا جتنا دباؤ ڈالتی گئی اتنا اس کو بھولتی جارہی تھی۔لوگ اس کے سامنے پیسے ڈال رہے تھے۔میں نے بھی دس روپئے کا ایک نوٹ نکالا اور اس کے بچے کے ہاتھ میں تھما دیا۔اس عورت نے اپنی نظریں میری طرف اٹھائیں۔تو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ کر کے آنسو ٹپک پڑے۔مگر منہُ سے ایک لفظ بھی کہہ نہ سکی۔میں آگے چلی گئی مگر ذہن میں ان تینوں بچوں کی تصویر بیٹھ گئی۔میں اپنے ذہن کو کُرید کُرید کر یہ بات پوچھ رہی تھی۔

''کون ہے یہ عورت؟ میں اسکو کیسے جانتی ہوں؟''

''کیا میں نے اس کو ہمیشہ سڑک پر ہی بھیک مانگتے ہوئے دیکھا ہے۔۔۔؟''

اسی اثنا میں، میں سکول کے احاطے میں پہونچ گئی۔جہاں ننّھے ننّھے بچوں کو تعلیم سے آراستہ کرنا ہی میرا کام تھا۔ان بچوں کو دیکھ کر میرا دل کس قدر پُر درد تھا یہ ان بچوں کے پڑھنے لکھنے کے دن ہیں اور وہ سڑک پر بھیک مانگنے کے لئے سڑک پر آگئے ہیں۔

سکول کے صحن میں داخل ہوتے ہی میری نظر گیٹ کیپر پر پڑی۔سلام علیک کے بعد جونہی میں آگے چلی تو صفائی والا نظر آیا۔اس کے ساتھ بھی سلام علیک کی اور میں آگے

چلتی گئی جہاں پر سکول کے بچے صبح کی پریئر (دعا) کے لئے جمع ہو رہے تھے۔ میں آگے آگے چل کر ان بچوں کے پاس آکر رُک گئی۔ بچوں نے آج کا پریئر شروع کیا۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری

زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

میں بھی اس دعا کے الفاظ کو ان بچوں کے ساتھ ساتھ دہرانے لگی۔ میری نظر سکول کے نئے چپراسی پر پڑی جو سکول کی طرف آرہا تھا۔

میں سکول کے پرانے چپراسی علی محمد کے بارے میں سوچنے لگی۔ کہ بیچارہ ابھی کچھ مہینوں پہلے کتنا ہٹا کٹا تھا۔ سال بھر پہلے میں نے اس کو اپنی بیوی بچوں کے ساتھ گردش پر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ کتنا خوش تھا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ہڈیاں نکل آئی۔ مگر کام کر کر کے اپنی جان نکالتا تھا۔ اور اپنے بیوی بچوں کو پالتا تھا۔ بچوں کا داخلہ پرائیویٹ سکول میں کیا تھا اور دن رات محنت مزدوری کرتا تھا۔ بچوں کی فیس کے لئے پیسہ اکھٹا کرتا تھا اور ان کو اچھی تعلیم دینے کی کوشش کرتا تھا۔ بے چارہ کچھ مہینوں میں ہی اس کو کینسر ڈائگنوز (diagnose) ہوا تھا اور اسی بیماری نے اس کو سر راہ لاکھڑا کر دیا۔ سکول کے سارے سٹاف نے اسکے لئے پیسے جمع کر دئے۔ اور وہ تب دہلی چلا گیا تھا۔ مگر دلی والوں نے اس کو علاج میں بتا دیا کہ اس کو ہر مہینے کیموتھرپی کے لئے آنا پڑے گا۔ غریب کے پاس پہلے سے اتنی ہی صورت تھی کہ۔۔۔۔۔

اب اور کہاں سے لاتا۔۔۔۔ سکول والے، سٹاف، تدریسی عملہ، غیر تدریسی عملہ۔ اور باقی سب بھی اس کی مدد کر رہے تھے۔ مگر خدا کی مرضی کے آگے کس کی چلی ہے۔ اور ایک دن۔۔۔۔ بے چارہ۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس عطا کرے۔

رفتہ رفتہ اس کی بیوی بھی لاغر ہو گئی۔ غربت اور مسکینی کی وجہ سے پیٹ پالنا ہی بہت مشکل تھا، تینوں بچوں کا سکول آہستہ آہستہ چھوٹ گیا۔

بچے۔۔۔تینوں بچے۔۔۔دو بیٹیاں۔۔ایک بیٹا۔۔۔ بچے۔۔۔ بیوی۔۔۔

خدایا یہ کیا ہو گیا۔۔۔ اوہ وہ تین بچے ۔۔۔خدایا ۔۔۔میں نے ان کو کیوں نہیں پہچانا۔۔۔میں نے تو ان کو علی محمد کی موت پر بھی دیکھا تھا۔۔۔اوہ خدایا۔۔۔وہ اب۔۔۔ بھیک۔۔۔۔؟۔۔؟۔۔؟

(۱۴) آشیانہ

''ابّا آپ کیسے ہیں''۔ نیلم نے کمرے کے اندر آتے ہی ابّا سے پوچھا

''بہت اچھا بیٹی، تم سناؤ، تم ٹھیک تو ہو۔؟''

''آؤ بیٹھو، آج بہت دنوں کے بعد تمہارا دیدار ہوا ہے۔''

''نہیں ابّا اصل میں آج کل دفتر میں اتنا کام ہوتا ہے۔ کہ فرصت ہی نہیں ملتی۔ دفتر کے بعد گھر، بچے تو سارا دن نکل جاتا ہے۔''

ادھر اُدھر کی باتیں ہونے کے کے بعد ابا بھی چپ ہوئے اور نیلم بھی ہاتھوں میں سلائیاں لیکر کچھ بننے کی کوشش کرنے لگی۔

مگر وہ بار بار ابا کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی جن کی گہری لکیریں آج اور بھی گہری ہو چکی تھیں۔ نیلم کو لگ رہا تھا کہ ابا نے اتنی باتیں کی مگر اس کے دل میں کسی قسم کا درد ہو رہا تھا۔ جس کو وہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

نیلم کی شادی ہوئے بیس سال ہو چکے تھے۔اوراس کا بھائی بھی بال بچوں والا تھا۔وہ ابا کی اکیلے ہی دیکھ بھال کرتا تھا۔نیلم تو کبھی کبھار فرصت ملنے پر ابا کو دیکھ لیتی اور واپس چلی جاتی ۔ابا بھی اب بوڑھا ہو چکا تھا۔گھر میں پوتے پوتیوں کی کمی نہ تھی ۔مگر ابا خود ہی اپنوں اور عزیزوں سے دور دور رہنے لگا۔شاید ابا اب اپنے آپ کو اس گھر کا ایک فالتو سامان سمجھتے تھے جو صرف اس لئے زندہ ہے کہ اللہ نے ابھی تک اس کو زندہ رکھا ہے۔

جب سے اس کی بیوی فوت ہوئی ہے اس نے دنیا اور مافیہا کو ہی چھوڑ دیا ہے۔سارا دن یادالٰہی میں لگا رہتا۔کھانا پینا بھی بس اتنا کہ بس جو اس کو زندہ رکھ سکے۔نہ کہیں جانے کی آرزو نہ کسی سے ملنے کی تمنا۔نہ کچھ کھانے کا شوق اور نہ ہی پینے کی ہوس۔بس چائے ،کھانا جب بہو لے آتی وہ کھاتے ۔

نیلم نے اس کے چہرے کے درد کو اپنے اندر محسوس کیا۔اور اسکی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے ۔اس نے جرٔات کر کے ابا سے پوچھا،

''ابا آپ ایسے کیوں اداس بیٹھے ہیں۔''

''نہیں تو،معلوم نہیں تمہیں کیوں لگ رہا ہے،''ابا نے سچ کو چھپانے کی کوشش کی''۔

''نہیں ابا۔آپ بولئے کیا بات ہے۔آپ کسی چیز کو چھپا رہے ہیں۔کیا بھیا نے آپ سے کچھ کہا ہے۔''

نیلم کا اتنا کہنا تھا کہ ابا کی آنکھیں بھر آئیں۔

''نیلم تم کیوں ناحق باتوں کو طول دیتی ہو۔بالکل کچھ نہیں ہوا ہے۔انسان جب

بوڑھا ہو جاتا ہے اور خاصکر اکیلا ہو جاتا ہے تو اس کے ساتھ ایسی باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہے۔''

''ابا؟ مجھے بتایئے تو کیا ہوا ہے۔'' نیلم نے پوچھا۔

''کچھ نہیں بس تم پریشان مت ہو جاؤ۔ میں ٹھیک ہوں۔ میرے اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ آج مرا کل دوسرا دن۔ آج نہیں تو کل۔۔۔''

ابا کہہ ہی رہا تھا کہ نیلم کی آنکھوں سے آنسو اترنے لگے۔ جن کو وہ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ابّا پلیز، ایسا مت کہیئے۔۔ دیکھئے میں پھر رو پڑوں گی۔۔۔۔'' اور روتے روتے ہی بولی۔

''آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔۔ کیا کسی نے کچھ کہہ دیا۔۔''

''ارے بیٹی نہیں۔۔ مجھے کوئی کیا کہے گا۔۔۔ تیری ماں جب زندہ تھی تب میں بھی زندہ تھا۔ کتنے سُکھ بھرے دن تھے۔ کس قدر خوشحالی تھی۔ مگر۔۔ مگر جب سے وہ جنّتی گئی ہے میری دنیا ہی اُجاڑ کر گئی ہے۔ میری زندگی میں زندگی جیسا لفظ ہی گم ہو گیا ہے۔ میں زندہ تو ہوں مگر جینا کس کو کہتے ہیں یہ آج مجھے معلوم ہی نہیں۔ میں آج بچوں پر ایک بوجھ بن گیا ہوں۔ موت میرے بس میں تو نہیں۔ ورنہ میں آج ہی اس دنیا کو چھوڑ کر جاتا۔ میرے بچے بھی آرام کرتے اور اس بوڑھے کے بوجھ سے چھٹکارا پاتے۔''

نیلم روئے جا رہی تھی۔ ''نہیں ابّا آپ کسی پر بوجھ نہیں ہیں۔'' پھر دوبارہ کہا

’’چلیئے آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیئے۔ وہ بھی تو آپ کا گھر ہے۔ وہاں میں خود آپ کی دیکھ بھالکروں گی۔ آپ جو جھوٹا چھوڑ دو گے میں وہی کھاؤں گی۔‘‘

’’نہیں نہیں۔ اب وہ وقت نہیں ہے کہ زندگی کے آخری لمحوں میں اپنا آشیانہ چھوڑ کر کہیں اور جاؤں‘‘۔ ابا نے ایک لمبی سی درد بھری آہ بھری اور کہا۔

’’میں جیسا ہوں ۔۔ جس حال میں ہوں ۔۔ مجھے رہنے دو بیٹی ۔۔ میں زندگی کی آخری گھڑیاں یہاں ہی گذارنا چاہتا ہوں ۔۔ ورنہ جو ذلّت ایک باپ نے آج سہی ، اس کے بعد ایک باپ کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔‘‘

’’کیسی ذلّت۔ ابّا آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں‘‘

’’وہی جو بات میرے دل و دماغ میں گونج رہی ہے ۔۔ تمہارے بھّیا کی ایک بات ۔۔‘‘

’’کونسی بات؟‘‘ نیلم حیرانگی اور نا سمجھی کے عالم میں اسے پوچھ رہی ہے۔

’’اسنے مجھ سے کہا کہ ’’تمیں تو زہر کھا کر مر جانا چاہیے۔ ورنہ میں زہر کھالوں گا‘‘ اس کا غصہ بیٹی بار بار میرے دماغ پر ہتھوڑے مار رہا ہے۔‘‘

’’بس ابا چلیئے میرے ساتھ ۔۔ اب میں آپ کو ایک پل بھی اس گھر میں رہنے نہیں دوں گی۔ چلیئے اٹھیئے۔‘‘ نیلم نے قدرے تحکمانہ انداز میں کہا۔

’’نہیں بیٹی ۔۔ بے وقوفی کی باتیں مت کرو ۔۔ میں نے کہا نا میں اس وقت اپنے آشیانے ، اپنے گھر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا ۔۔‘‘ ابا نے بھی فیصلہ کن جواب دیا۔

’’آپ کا درد مجھ سے دیکھا نہیں جاتا ہے ابا ۔۔‘‘

''تم اپنے گھر چلی جاؤ۔۔اور سنو۔۔۔اپنے بھائی سے اس کا ذکر بھی مت کرنا۔''

''یہ کیسا حکم ہے ابا۔ چلیے پھر میں آپ کے پاس رکتی ہوں۔آج آپ کو میری ضرورت ہے۔''

''نہیں میں نے کہا نا۔تم اپنے گھر چلی جاؤ۔۔۔اپنے ساس سسر کا خیال رکھنا۔۔وہی تمہارے ماں باپ ہیں۔تم ان کا خیال رکھو گی تو میرے دل کو بڑی شانتی ملے گی۔''

''جی ابا آپ کہتے ہیں تو چلی جاتی ہوں۔۔''

نیلم اٹھ کر باہر جانے لگی۔ابھی دروازے کے پاس پہونچی ہی تھی کہ ابا کی ایک ہلکی سی چیخ سنائی دی۔نیلم دوڑ کر الٹے پاؤں واپس آ گئی۔

ابا کا ایک ہاتھ دل پر تھا اور دوسرا ہاتھ اس ہاتھ کے اوپر۔نیلم ابا کے نزدیک گئی تو انہوں نے کہا۔

'' اپنے بھائی سے کہنا، مجھے زہر کھانے کی ضرورت نہیں پڑی، میری دعا قبول ہو گئی۔''اور اسی کے ساتھ اس نے اپنی آنکھیں بند کی۔اور آرام اور سکون ان کے چہرے پر چھا گیا۔

(۱۵) بی اماں

ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کا احساس ہو رہا تھا۔ دن کے دو بج چکے تھے۔ بی اماں بستر پر بیٹھی مضطرب سی ہو رہی تھی۔ اور آہستہ آہستہ کراہ رہی تھی۔ اسی دوران چھوٹی کو آواز دینے لگی۔

''چھوٹی۔۔چھوٹی۔۔۔چھوووٹی ی ی۔۔۔۔چھووٹیی ی۔۔اونہہ''

بی اماں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہی تھی۔ مگر جواب میں چھوٹی کی آواز نہیں آ رہی تھی۔

''چھوٹی۔۔چھوٹی۔۔چھوٹی۔۔کہاں مرگئی۔۔زمین تو نہیں نگل گئی۔۔آسمان تو نہیں کھا گیا۔۔کہاں پہونچ گئی۔۔۔چھوٹی اونہہ''

''موئی۔۔جانے کہاں جاتی ہے۔۔مجھے اکیلا چھوڑ کر اونہہ۔''

''کونسا کام تھا جو کرنے گئی ہے۔۔جنم جلی۔۔پاگل۔۔۔بے وقوف ۔۔اونہہ''

''مرگئی شاید۔۔گُم ہوگئی۔۔شاید بھاگ گئی۔۔''

''کالی کلوٹی۔۔جہاں کی ہے وہاں واپس چلی گئی شاید اونہہ''۔

''اتنی دور کی ہے۔۔معلوم نہیں کہاں کی۔۔۔کیسے ہمارے ہتھے چڑھ گئی۔۔۔اونہہ''

''بہو کہتی ہے بارہ ہزار دے کر لایا گیا ہے اور اس پر مہینے کی تنخواہ دو ہزار الگ۔۔مانو تین ہزار مہینہ۔۔''

''مگر جنم جلی۔۔کام کی نہ کاج کی دشمن اناج کی۔۔'اونہہ'

''جب آئی تھی تب جسم پر ہڈیوں اور پوست کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔۔جب سے چاولوں کے پلیٹ بھر بھر کر کھاتی ہے۔سارا چہرہ بھر گیا ہے۔۔۔اونہہ''

''کالا پن ایسا تھا کہ دیکھتے ہی انسان کو قے آنے لگتی تھی۔مگراب دیکھو روز گرم پانی سے نہا نہا کر، صابُن لگا لگا کر گلابی رنگ نکھر گیا ہے۔اونہہ۔''

''کپڑے بھی اب صاف شفاف پہنتی ہے۔۔۔بہو رانی نے بھی اس کو سر چڑھا لیا ہے روز نئے نئے کپڑے دیتی ہے۔۔۔دیتی تو اپنے پرانے کپڑے ہی ہے۔۔۔مگر وہ پرانے تھوڑی ناہیں۔۔۔نہ کہیں رنگ اترا ہے اور نہ کہیں سلائی۔۔۔اور یہ موئی بھی پہنتی جاتی ہے اور موج کرتی ہے۔۔۔جنم جلی۔۔۔آخر گئی کہاں۔۔۔۔ چھوٹی۔۔۔چھوٹی ۔۔۔اونہہ۔۔۔اونہہ''

بی اماں۔۔۔اپنے ہی ساتھ بولے جا رہی تھی۔اور صدائیں دیئے جا رہی تھی۔مگر جواب ندارد۔

تنگ آکر اماں اپنے نرم ملائم بستر ے سے اٹھنے لگی۔اپنے دونوں گھٹنوں کے اوپر اپنے دونوں ہاتھ رکھے۔اور کہنے لگی۔''آرام سے بیٹھنے بھی نہیں دیتی ہے موئی۔۔۔کام چور۔ اونہہ''۔

ابھی وہ بستر سے اترنے ہی لگی تھی کہ چھوٹی داخل ہوئی۔

''جی اماں۔۔جی اماں۔۔'' چھوٹی دوڑتی ہوئی آئی اور اماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''کہاں مر گئی تھی؟''

''اماں پہلے میں نہاتی تھی نا۔۔۔اب کپڑے دھوتی تھی نا۔۔۔آپ کو کچھ کام کرنا تھا؟ مجھ کو بلاتا تھا۔۔۔''

''ہاں۔۔اور کیا۔۔مجھے ایک ٹوتھ پک چاہئے تھی۔میرے دانت میں کچھ پھنس گیا ہے۔''

''میں ابھی لائی اماں۔۔'' چھوٹی دوڑتی ہوئی اندر چلی گئی اور دوڑتی ہوئی ٹوتھ پک کی چھوٹی سی ڈبیا لیکر واپس آ گئی۔

''یہ لو اماں۔یہ میں لے آئی ٹُپ ٹِک'' اماں نے ایک ٹوتھ پک نکالی اور دانتوں میں سے کچھ نکالنے لگی۔

''جاؤ ذرا میرے لئے پانی کا ایک گلاس لیکر آؤ۔بھر کر نہیں لانا۔آدھا ہی لانا، ورنہ ضایع ہو جائے گا۔۔۔میں سارا نہیں پی سکتی ہوں نا۔۔۔جاؤ جلدی جاؤ۔ میرے دانتوں میں ٹھنڈے پانی سے جھنجناہٹ ہوتی ہے۔''

''گرم کر کے لاؤں پانی؟''

''نہیں کرم جلی۔گرم پانی سے پیاس تھوڑی نا بجھتی ہے''۔

چھوٹی پھر سے دوڑ کر گئی اور اب کے پانی کا ایک گلاس لیکر آ گئی۔

''ارے بدھو، بے وقوف۔کہا تھا نا آدھا لانا۔سُنتی نہیں ہے۔بہری ہو گئی ہے۔۔۔دیکھو BOILED پانی ضایع ہو جائے گا۔جاؤ آدھا کچن میں واپس رکھ دو۔''

چھوٹی نے ایک لمبی آہ بھر کر گلاس پھر ہاتھ میں اٹھا لیا اور واپس چلی گئی۔اور ایک ہی لمحے میں لوٹی۔راستے میں ہی آدھا گلاس واش بیسن پر پھینک کر آئی۔تاکہ اماں کی کھِٹ کھِٹ

بند ہو جائے۔

اماں نے پانی پی لیا۔اور گلاس پکڑا کر بولی۔''جاؤ گلاس کچن میں رکھ دو۔اونہہ۔''

''ابھی رکھے گی۔'' گلاس ہاتھ میں رکھ کر چھوٹی نے دھیرے سے کہا۔

چھوٹی کا نام چھوٹی نہیں بلکہ وینا تھا۔مگر جب سے اماں کے گھر میں آ گئی ہے سب اُسے چھوٹی ہی کہتے تھے۔اسی لئے چھوٹی کہتے کہتے نام ہی چھوٹی پڑ گیا۔اس چھوٹی لڑکی کو بہار سے منگایا گیا تھا بارہ ہزار کے عوض۔اور ہر مہینہ کی تنخواہ دو ہزار الگ۔

بہو بیگم سکول میں ماسٹرانی تھی۔وہ تو چھوٹی کو بہت پیار کرتی تھی۔اس کی اپنی بھی ایک بیٹی تھی۔جو پروفیشنل کالج میں پڑھتی تھی۔اور صبح سے شام تک پڑھائی میں مصروف تھی۔اس کے استعمال شدہ کپڑے۔اسکے قسم قسم کے جوتے،طرح طرح کے ڈوپٹے سب وینا کو دیتی تھی۔جو خود کھاتی تھی اور اپنی بیٹی کو کھلاتی تھی۔اسے بھی دیتی تھی۔بہو بیگم تو گھر آ کر گھر کا سارا کام خود کرتی تھی۔

مگر بی اماں۔۔توبہ۔۔۔سارا کام تو اسی سے کراتی تھی۔کبھی بیٹھنے ہی نہیں دیتی تھی۔کبھی چائے۔کبھی پانی۔۔کبھی اوپر۔۔کبھی نیچے۔جب بہو بیگم ڈیوٹی پر جاتی ہے تو بی اماں چھوٹی کو سارا دن مانو ایک ٹانگ پر رکھتی ہے۔بیٹھنے ہی نہیں دیتی۔اور اگر کبھی چھوٹی بیٹھ بھی جاتی تھی تو اماں ایک دم پکارنے لگتی۔

''چھوٹی۔۔چھوٹی۔۔ادھر آ جاؤ۔۔آ و میرے پاس بیٹھو۔''اس کو سارا دن اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتی۔جیسے وہ کہیں بھاگ جائے گی۔

بی اماں گھر کی دادی تھی۔اور نہ جانے کتنے سال ہو گئے تھے کہ یہ شوہر کے بغیر رہتی تھی۔شاید اسی وجہ سے اس نے جو حکم کیا وہی سب نے مانا۔اس کے سامنے کسی کی ایک

نہ چلتی تھی۔ یہ کسی کی بات نہیں مانتی تھی اپنی بات سب سے منواتی تھی۔ بہو بیگم کے آنے سے اس کی عزت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔اس نے ہمیشہ اپنی ساس کو اپنی ماں کا درجہ دیا۔اوراس کی ہر بات مان لی اوراسکی ہر جائز اور ناجائز بات میں خاموشی اختیار کی۔۔۔۔

مگراس نے بہو بیگم کو کم تو نہیں ستایا۔مگر وہ خاموش رہتی تھی۔۔۔۔

کسی بھی بات کا جواب نہیں دیتی تھی۔ بی اماں اگر کسی بات پر غصہ بھی ہوتی یا بگڑ جاتی ۔مگر بہو بیگم نے کسی بات پر غصہ کا جواب غصہ سے نہیں دیا۔

بی اماں آدھی ہی رات کو اٹھتی تھی۔تہجد پڑھتی، فجر پڑھتی اور پھر سو جاتی ۔مگر سورج کی پہلی کرن ابھی زمین پر پڑتی بھی نہ تھی کہ اس کی آنکھ کھل جاتی۔

بی اماں کا بیٹا ہی اس کے لئے سب کچھ تھا۔ یہ صرف اپنے گھر کی بی اماں نہیں تھی۔ بلکہ پورے خاندان اور پورے محلے کی بی اماں تھی۔اس کی ہر چیز up to date ہونی چاہئے تھی۔ کپڑے، زیورات، جوتے، اور کمرہ۔۔۔اس کا کمرہ سارے گھر سے زیادہ صاف شفاف اور چمکدار تھا۔۔۔

کمرے کی ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی۔۔۔۔

نیا بیڈ، نیا بسترہ، نئے نئے بیڈ کور۔۔۔۔

نئے پردے، نیا ڈریسنگ ٹیبل، نیا وارڈ روب۔۔۔۔سب چیزیں نئی ہونی چاہئے۔

سورج نے جب پہلی پرتو زمین پر ڈالی تو ایک کرن نے چھوٹی کی آنکھوں کے ساتھ بھی آنکھ مچولی کھیلنا شروع کیا۔اس نے اپنی آنکھیں موندلیں۔مگر دوسرے ہی لمحے بی اماں اس کے سامنے کھڑی، اس کی رضائی کو کھینچا تانی کر رہی تھی۔اور کہہ رہی تھی۔

"گنوار کہیں کی، بدتمیز کہیں کی۔ جاہل، سورج سر پر نکل آیا۔ابھی تک سوئی

ہے۔میرے لئے چائے کون بنائے گا۔تیراباپ؟۔''

چھوٹی اٹھ بیٹھی بھی نہیں بلکہ بستر ے سے نکلی اور دوڑ پڑی۔ابھی پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ پھراماں چلانے لگی۔

''چھوٹی۔۔کہاں گئی چائے لاؤ''۔

گھر کے سارے لوگ بھی اب اٹھ چکے تھے۔اماں کی کھٹ کھٹ چھوٹی کے ساتھ چلتی ہی رہتی تھی۔کبھی اس کو اٹھنے کو کہتی تو کبھی بیٹھنے کو۔اماں کو اپنے بیٹے نے اس کے ساتھ کھٹ کھٹ کرتے سنا تو اس نے کہا۔

''اماں کیوں سارادن اس غریب پر چلاتی رہتی ہو۔کچھ رحم بھی تو کیا کرو۔''

بس بیٹے کا اتنا کہنا تھا کہ اماں اُبل پڑی۔''میں اس کو کیا کہتی ہوں۔اب توسِکھانا بھی نہیں چاہیئے؟ سوچتی ہوں میں نہیں سکھاؤں گی تو اس بچاری کو کون سکھائے گا۔اس پر بھی آپ کہتے ہو کہ میں چلاتی ہوں۔چلو آج کے بعد میں کچھ نہیں کہوں گی اسے۔مگر ابھی تو بلاؤ چائے تولائے گی۔''

''مگر چھوٹی ہے کہاں،''اس کے بیٹے نے پوچھا

''شاید منہ دھورہی ہے''

''شاید چائے بنارہی ہے''

''نہیں اماں باہر کا دروازہ کھلا ہے شاید گھر چھوڑ کر بھاگ گئی ہے''۔بہو نے اندر آتے ہی بولا

''بھاگ گئی؟۔۔۔مگر کیوں؟۔۔ایسا کیا ہوگیا''؟۔

''بے چاری چھوٹی۔۔۔۔بھاگ ہی گئی ہوگی۔۔۔۔'' بیٹے نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

دور سے ایک آواز آئی۔۔۔چھوٹی چلا رہی تھی۔ ''نہیں اماں ۔۔۔میں کہاں جاؤں گی ۔۔۔میں یہاں ہوں۔۔میں جا بھی کہاں سکتی ہوں۔۔۔میں موئی اتنی دور کی ہوں کہ وہاں اکیلی جا بھی نہیں سکتی ہوں۔ ۔۔۔میں اکیلی لڑکی یہاں ہوں''۔

☆☆☆

(۱۶) کالے سائے

شام کے دھندلکے سائے آہستہ آہستہ بڑھنے لگے تھے۔ ماریہ کمرے میں داخل
ہوگئی۔۔۔ اچانک اس کی نظر کمرے میں لگے کلینڈر پر پڑگئی۔ جس میں ایک لڑکی نیلے بلوز
اور نیلی ساڑھی میں غضب ڈھا رہی تھی۔ ساڑھی ایسی کہ پورا بدن ساڑھی کے اندر سے
جھلک رہا تھا۔ بلوز کا گلا بڑا تھا اور بغیر بازو کے تھا۔ لمبائی میں اتنا چھوٹا کہ پہننا نہ پہننا ایک
جیسا۔ پیٹی کوٹ اور بلوز کے درمیان میں بہت فاصلہ تھا۔

جسم کو کور کرنے کے باوجود بھی اس کا آدھا جسم ساڑھی میں سے نظر آ رہا تھا۔ اور
پھر اس پر شانوں تک کھلے ہوئے بال۔۔۔ ماریہ کا دل یہ سب دیکھ کر مچل سا گیا۔۔۔
اچانک۔۔۔ وہ الماری کی طرف لپکی۔۔۔ اور ایک نیلی ساڑھی باھر نکالی۔

یہ ساڑھی بھی کیلنڈر والی کی ساڑھی سے ملتی جلتی تھی۔ وہی رنگ، ویسی ہی

ٹرانسپیر نٹ، اور بلوز بھی کچھ ایسا ہی نکالا۔ جو اسی رنگ کا تھا جس رنگ کا بلوز کلینڈر والی لڑکی نے پہنا تھا۔

'' کس قدر دلکش ہے۔اس سے پہلے مجھے یہ تصویر کبھی نظر کیوں نہیں آئی ؟'' پھر خود ہی اپنے آپ کو جواب دیا۔

''اوہ۔مما نے اس کلینڈر کا ورق الٹایا ہے۔''

''کس قدر حسین ہے یہ تصویر''

''اگر میں ایسی ساڑھی پہنوں گی تو کیا میں بھی اتنی خوبصورت نظر آؤنگی۔؟''

ماریہ جلدی جلدی اپنا لباس تبدیل کرنے لگی۔اس نے ایک سادہ سا سوٹ پہنا ہوا تھا۔

ساڑھی پہننے کا رواج تو اب شہر میں تھا ہی نہیں۔ کیونکہ اب اس پر قدغن(ban) لگ چکی تھی۔مگر ساڑیوں اور high heel چپلوں اور جوتوں کی بہت ساری collection ماریہ کے پاس تھی۔اسے ساڑھی پہننا بہت اچھا لگتا تھا۔وہ اکثر اپنی تنہائی میں ساڑھی پہنتی تھی۔اس کا کہنا تھا کہ ساڑھی میں ایک لڑکی کا figure جچتا ہے۔مگر اب بہت عرصے سے وہ سادہ سا سوٹ پہنتی تھی۔

ساڑی پہن کر وہ پھر کیلنڈر کے پاس کھڑی ہوگئی۔اور ایک نظر اُس پر اور ایک نظر اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔

۔۔۔ڈریسنگ ٹیبل کے پاس جا کر اپنے ریشمی بال، جو ایک بڑی back pin میں بند کئے ہوئے تھے، کھول دیئے۔اور اپنے شانوں پر ڈال دیئے۔

بلوز کا گلا بڑا نہیں تھا۔مگر وہ بار بار اسے نیچے کھینچ رہی تھی۔تا کہ اس کا گلا بھی

نظر آئے۔

شام کے سائے اور بھی کالے ہونے لگے۔اس نے اپنے کمرے کے سارے بلب روشن کیئے۔کمرے میں لگے جالی کے پردوں کے بیچ میں سے روشنی باہر چھلک رہی تھی۔

۔۔ایک بیس بائیس سالہ لڑکی

۔۔بلیو رنگ کی ساڑھی

۔۔بلوز آدھ کھلا

۔۔بدن نُما ساڑھی

۔۔۔چنچل اور شوخ۔

ٹھیک گھر کے باہر ایک آرمی پکٹ تھا۔ایک آرمی والا کب سے یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔شام کے کالے سائے جتنے جتنے بڑھتے گئے اتنے اتنے اس کی شکل اور بھی صاف دکھائی دینے لگی۔ماریہ نے ٹیپ ریکارڈر آن کیا اور اس پر ایک تیز دھن والا گانا لگایا۔

''ذرا ذرا ٹچ می ٹچ می۔کس می کس می کس می،ذرا ذرا''

اس کے پاؤں بھی اسی گانے کی تال پر تھر کنے لگے۔

''میں آج کتنا اچھا محسوس کر رہی ہوں''۔

''میں چاہتی ہوں ساری عمر ایسے ہی ناچتی رہوں''۔

''میں چاہتی ہوں وقت یونہی رک جائے''۔

''میں بس ایسے ہی۔۔۔ایسے ہی۔۔

اچانک اس کی نظر اسی کیلنڈر پر جا کر رک گئی۔جس کے کونے پر ایک ٹیبل بنا تھا اور اس پر لگا

گلدان گرا ہوا تھا۔اور دوسری طرف ایک بڑھتا ہوا ہاتھ۔جس میں سے شراب کا پیالہ گرا ہی چاہتا تھا۔وہ غور سے اسے دیکھنے لگی اور۔۔۔قریب آئی۔۔یہ ۔۔ہاتھ۔۔

یہ ہاتھ اس نے اپنے شانے پر محسوس کیا۔اس نے اپنی گردن گھما دی اور اپنی ساڑھی کا پلو سنبھالا۔اچانک جیسے سارا آسمان اس پر ٹوٹ پڑا یہ اس کے سامنے کون ہے آرمی والا۔

''نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔خدا کے لئے۔۔۔پلیز خدا کے لئے۔۔۔مجھے چھوڑ دو۔۔۔میرے ساتھ کچھ نہ کرنا۔۔۔۔پلیز۔۔۔۔پلیز۔۔۔پلیز۔''

شام کے سائے اور بھی گہرے ہو گئے اور کالی رات نے اپنا ڈھیرہ ڈال دیا۔

☆☆☆

(۱۷) برتھ ڈے

سارے گھر میں آج خوشیوں کی گونج تھی۔ پانچوں بہنیں مٹھائیاں لالا کر ٹیبل پر سجا رہیں تھیں۔ کوئی برفی کی پلیٹ سجا رہی تھی۔ تو کوئی بول (bowl) میں رس گلے ڈال رہی تھی۔ ہر ایک کی زبان پر ایک ہی نام تھا۔ ''مُنا'' اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب کی بار مُنا پیدا ہو گیا'' زہرہ نے سارا سے کہا۔

''میں نے تو اب کی بات منت مانی تھی کہ اگر اب کی بار مما کو مُنا ہو گیا تو میں یتیم ٹرسٹ میں گیارہ سو روپیئے بھیج دوں گی۔

''سارہ! بھولنا نہیں۔ کہتے ہیں کہ منت پوری ہو جانے پر اگر نیاز نہ ڈالیں گے تو۔۔۔۔''

''نہیں ایسا مت کہو۔ ممی منّا کو لیکر گھر آئے گی تو میں نیاز ڈالوں گی''

”میں نے بھی تو کوئی چیز رکھی ہے نیاز میں دینے کے لئے“۔روبی نے بھی ان کی باتوں میں ٹانگ اڑائی۔

”ارے ارے میری لاڈو تم نے کونسی چیز نیاز میں دینے کے لئے رکھی تھی۔“

”زہرہ باجی۔۔جی۔۔میں نے۔۔اپنی ٹوڑیوں۔۔کا بہت۔۔ہی خوبشورت۔۔سیٹ رکھا ہے۔اور اللہ۔۔میاں۔۔سے کہا ہے۔۔کہ اگر۔۔مما میرے۔۔لئے بھائی ۔۔لائے گی۔تو میں ی۔۔ہ ٹوڑیوں کا۔۔شیٹ۔۔گڈیا۔۔کو دوں۔۔گی۔وہ بہت غریب ہے نا۔اش کے پاس۔۔ٹوڑیاں۔۔نہیں ہیں۔“

”بہت۔۔اچھا۔۔کام کیا۔۔ہے تو نے۔۔جو گڈیا کے لئے۔۔ٹوڑیاں۔۔رکھی ہیں۔ میری گڈیا“زہرہ نے بھی اسی کی آواز میں بولنے کی کوشش کی ہے۔“

زہرہ نے دسویں پاس کیا تھا اور اب وہ گیارھویں کا فارم بھر چکی تھی۔اور سارہ نویں میں آچکی تھی۔شاذیہ ساتویں میں اور اسکے بعد شافیہ پانچویں میں پڑھتی تھی۔ان سب کی لاڈلی بہن جو پانچویں چھوٹی سی روبی جو تیسری کلاس میں پڑھتی تھی۔اس کی ننھی ننھی اور پیاری پیاری باتیں سب کا من بہلاتیں تھیں۔مگران کے مما پاپا کو ایک بیٹے کا انتظار تھا۔خورشید احمد ان کا پاپا بیٹے کے لئے اس قدر نہ ترستا تھا جس قدر اس کی بیوی سلیمہ۔

جب سے امیدواری ہوئی تب سے ایک ہی رٹ لگائے ہے۔”اے اللہ اب کی بار مجھے بیٹا دینا“۔

”بیٹا ہوگا تو ایسا کروں گی،

بیٹا ہوگا تو ویسا کروں گی،

بیٹا ہوگا تو یہ چڑھاؤں گی، وہ چڑھاؤں گی۔

اس لئے سب بیٹیوں نے بھی کچھ نہ کچھ نذر و نیاز رکھے تھے۔اور وہ دل سے چاہتے تھے کہ ان کی ماں کی دلی مراد پوری ہو جائے۔

شاذیہ اور شافیہ کمرے میں ممی کا بیڈ سجا رہیں تھیں۔اور دونوں اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔" شاذو دی۔ممی آئے گی تو سب سے پہلے منّا کو میں پکڑوں گی۔"شافیہ نے خوشی سے سرشار ہو کر کہا۔

"آنے دو اسے۔تیرے سے بڑی تو میں ہوں۔پہلے میں اسے گود میں لوں گی۔"شاذیہ نے اکڑ کر کہا۔اتنے میں کسی نے آواز دی۔

"پاپا آ گئے۔پاپا آ گئے۔مما اور مُنا کو لیکر۔۔۔

دیدی۔۔۔دیدی۔۔۔سب آجاؤ پاپا، مما آ گئے۔

پھر کیا تھا سب دوڑ پڑے۔

مُنّا، مُنّا۔۔۔منا ۔۔۔ہر طرف سے مُنا منا کی گونج ہونے لگی۔

پہلے میں منا کو گود میں اٹھاؤں گی۔

نہیں پہلے میں۔

میں تو سب سے بڑی ہوں پہلے میں۔

میں۔۔تو ۔۔سب ۔۔سے ۔۔۔چھو۔۔ٹی ہو ں۔۔پہلے میں ۔پک۔۔ڑوں۔۔گی۔

مما نے ان سب کی لڑائی میں دخل اندازی کی۔اس نے کہا۔

تم سب بیٹیاں ایک لائن میں بیٹھو۔سب سے پہلے چھوٹی سے شروع کریں گے۔پہلے

چھوٹی پکڑے گی اور پھر شازو۔۔۔

''بس چلو۔۔بیٹھو اب۔۔''

منا کے آنے سے گھر میں رونق آ گئی۔خورشید احمد کے یہاں بیٹے کے انتظار میں پانچ بیٹیاں ہوئی تھی۔منا کے آنے سے میٹھے میں نمک کا مزہ آ گیا۔

☆

ہر سال بیٹے کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے مناتے تھے۔خوب مزے کرتے تھے۔اور ہنسی اور تالیوں کی گونج سے سارا گھر سر پر اٹھاتے لیتے تھے۔

آج اس کی نویں سالگرہ تھی۔بہنوں نے سارا گھر پھولوں سے سجایا تھا۔اس کے لئے زہرہ نے اپنے بھائی کے لئے ایک اچھا سا لباس خریدا تھا۔گولڈن رنگ کی شیروانی اور میرون رنگ کا پاجامہ۔اس کے ساتھ گولڈن رنگ کی جوتی اور میرون رنگ کا اور لمبا سا ایک ڈوپٹہ بھی خریدا گیا تھا۔

''ذرا پہن کر دکھاؤ میرا راجہ بھیا کیسا لگتا ہے۔''

منا یہ ڈریس پہن کر آیا تو ایسا لگا کہ چھوٹا سا دولہا بن کر آیا۔

اہا۔۔اہا۔تم تو دولہے راجہ لگتے ہو۔

سب اسے پیار کرنے لگے۔ایک بہن چھوڑتی ہے تو ایک بہن گود میں لیتی ہے اور پیار کرنے لگتی ہے۔

منا کا دل کیا کہ وہ سب سے پہلے اپنا ڈریس اپنے دوست کو دکھائے گا۔اسنے اپنی بہنوں سے کہا۔''پہلے میں اپنے دوست کو دکھاؤں گا۔میں ابھی گیا اور ابھی آیا''۔

بہنوں نے نہیں مانا۔نہیں منا۔حالات ٹھیک نہیں ہیں۔تم باہر نہیں جاؤ گے۔

منّا نے ضد کی تو انہوں نے بھی نرمی ہی کی۔

''آج کے دن کیسی ضد کرتا ہے مُنّا۔جا جلدی سے جا اور واپس آ جا۔ہم کیک کاٹیں گے۔پاپا نے کیک لایا ہے۔''

منّا دوڑ کر دروازے سے باہر نکل گیا۔

اس کا دوست سڑک کے اس پار رہتا تھا۔

اس کے باہر جاتے ہی زور زور سے گولیوں کی آوازیں آ گئی۔سب لوگ باہر دوڑ پڑے۔

''ہائے ہائے مار ڈالا۔مار ڈالا'' باہر سے کسی عورت کی زور زور سے چلانے کی آواز آئی

''ارے ارے لاڈلے بیٹے کو مار ڈالا۔''

''جہنم جلو،۔۔۔کافرو۔۔مار ڈالا''۔

سب لوگ باہر نکل آئے تو دیکھا منّا خون میں لت پت، محلے کی کسی عورت نے اسے بانہوں میں اٹھایا تھا۔

سب بہنیں بُت بنی اسے پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہیں تھیں۔

☆☆☆

(۱۸) قہر

پولیس والوں کی ایک ٹولی عبداللہ کے گھر میں گھس گئی۔ اور اندر گھستے ہی بولی۔

''نذیر عرف جہانگیر شاہ کہاں ہے''؟

''او ماتا جی نذیر کہاں ہے؟ کہاں چھپا کے رکھا ہے اس کو۔'' بندوق برداروں نے عبداللہ کی بیوی راحتی سے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''ہمارے پاس اسکی گرفتاری کا وارنٹ ہے''۔

''صاحب وہ بہت دنوں سے گھر نہیں آیا ہے۔ معلوم نہیں کہاں ہے۔'' اماں نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

''کیا کام کرتا ہے تمہارا بیٹا؟ بندوقوں کا کاروبار یا بموں کا بیوپار''؟

اماں نے حیرانگی سے ان کی طرف دیکھا اور کہا۔''آپ کیا بات کرتے ہیں مجھے سمجھ میں نہیں آتا ہے۔''

''ہمیں تمہارے گھر کی تلاشی لینی ہے۔نذیر کو ڈھونڈنا ہے۔اسکو کہاں رکھا ہے۔'' ایک آرمی والے نے بندوق کی نوک ادھر ادھر کرتے ہوئے کہا۔

''چلو میرے ساتھ اوپر آجاؤ۔ مجھے تلاشی لینی ہے۔'']

راحتی ان کا بس چہرہ ہی دیکھتی رہی اور پھر چپ چاپ ان کے ساتھ ہولی۔اس وقت گھر میں کوئی مرد نہیں تھا۔صرف اسکی ایک جوان بیٹی تھی۔نذیر اس کا جوان بیٹا تھا۔جو بی اے کر چکنے کے بعد بے کار بیٹھا تھا۔ایک دن اچانک کپڑے باندھ کر کہیں جانے لگا۔جب ماں نے پوچھا تو بولا کہ میں کسی ٹریننگ پر جا رہا ہوں۔یہی میری نوکری کی شرط ہے۔چار مہینے تک اس کا کوئی اتا پتہ نہیں تھا۔اس دوران اپنے باپ کے نام تین بار دو دو ہزار روپیے بھیجے تھے۔تاکہ گھر کی حالت میں بہتری ہو۔انہوں نے بھی سمجھا کہ نوکری لگی ہے۔مگر جب سے آیا ہے پولیس اور آرمی پیچھے لگی ہے۔کبھی دن میں ڈھونڈتی ہے تو کبھی رات میں۔

''کیا اس کمرے میں رہتا ہے۔۔۔۔۔یہ اسی کی چیزیں ہے نا؟۔۔۔۔'' آرمی والوں نے ایک کمرے میں جا کر اس کی چیزوں کو تہس نہس کرنا شروع کیا۔''یہ کتابیں۔۔۔یہ کیا ہے۔۔۔فو۔۔ٹو۔۔۔یہ کیا ہے ؟ ۔۔۔کپڑے۔۔۔یہ کیا ہے۔۔۔یہ کاغذ۔۔یہ قمیضیں۔۔۔یہ بنیان۔۔۔یہ۔۔اُف گندے موزے۔۔۔۔یہ۔۔۔'' ہر چیز اٹھا اٹھا کے پھینکتے جا رہے تھے۔لگتا تھا کہ ان کو کچھ مل نہیں رہا تھا۔۔۔خدا جانے وہ کیا ڈھونڈ رہے تھے۔

''چلو دوسرا کمرہ دکھاؤ۔'' راحتی چپکے سے ان کے ساتھ ہولی۔اور دوسرے کمرے تک ساتھ گئی مگر دروازے کے پاس پہنچ کر اسکے قدم جیسے رُک گئے۔

انہوں نے دروازہ کو پاؤں سے دھکا مارا اور دروازہ زور سے کھل گیا۔اندر سکینہ بیٹھی پڑھ

رہی تھی۔ وہ ہڑ بڑا کر ایکدم اٹھ کھڑی ہوگئی اور ماں کے پاس چلی گئی۔

سکینہ بارھویں جماعت میں پڑھ رہی تھی اور امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔۔ وہ ایک بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ عبداللہ اور راحتی کے یہی دو بچے تھے۔ عبداللہ کھیتوں میں مزدوری کرتا تھا اور بہت کم کماتا تھا۔ گھر کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ مگر عبداللہ نے کچھ کر کے اپنے بچوں کو پڑھایا، لکھایا۔ وہ تو خود ان پڑھ تھا مگر بچوں کی پڑھائی پر زور دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے بچے اس کی طرح ان پڑھ نہ رہیں۔ وہ ان کو تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتا تھا۔ تا کہ جو مشکل اس کو پڑی اس کے بچوں کو دیکھنی نہ پڑے۔ اور اب تو اس کو اندر ہی اندر بیٹی کی شادی کی فکر لاحق تھی۔ مگر اس کے دل میں یقین تھا کہ بیٹی پڑھ لکھ کر کچھ حاصل کر ہی لے گی تو لڑکا بھی اچھا مل جائے گا۔ اس کی خوبصورتی دیکھ کر اس کی پوپھی اور ماسی اپنے اپنے بیٹے کا رشتہ لیکر آئے تھے مگر اس نے منع کر دیا۔ یہ کہہ کر کہ ابھی بچی چھوٹی ہے، ابھی اسکی شادی نہیں کروں گا۔

اندر آتے ہی آرمی والوں کی آنکھیں جیسے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''یہ لڑکی کس کی ہے۔؟ کیا جہانگیر شاہ کی بہن ہے۔'' ایک آرمی والے نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''اے لڑکی کیا نام ہے۔''

سکینہ جواب دئے بغیر ماں کے ساتھ چمٹ گئی۔ وہ ان وردی والوں سے بہت ڈرتی تھی۔ اسی وجہ سے ماں نے اس کو اتنی دیر آواز بھی نہیں دی تھی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ ماں بیٹیاں گھر میں اکیلی ہیں اور موئے وردی والے پانچ پانچ۔

''صاحب آپ تلاشی لے لو، کیا دیکھنا ہے۔۔۔۔۔'' راحتی نے کمرے کی چیزوں کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اب کس چیز کی تلاشی کرنی ہے۔اب تو بنا ڈھونڈے ہیرا مل گیا۔۔۔'' اسکی آواز میں شیطنت ابھر آئی۔وہ سکینہ کے نزدیک گیا۔اور سکینہ نے اپنا چہرہ ماں کے پیچھے چھپالیا۔ ماں نے بھی اسے پیچھے سے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔

ایک بندوق والا اسکے نزدیک گیا اور بندوق کی نوک سے اس کے چہرے کو چھوا۔اور پھر اسکا ہاتھ پکڑ کر ماں کے پیچھے سے نکال لایا۔

''یہ چاند بادلوں میں کیوں چھپتا ہے۔''

''ارے سنو۔۔۔''

راحتی غصہ بھری آواز میں کہنے لگی۔آپ لوگ جس لئے آئے ہیں وہ کر کے جاؤ اور نکلو۔میری بیٹی کی طرف خبردار آنکھ بھی مت اٹھانا۔۔۔''

''اچھا ہم کس لئے آئے ہیں؟۔۔۔اسی لئے تو آئے ہیں۔'' وردی والے نے مذاقاً کہا۔اور زور سے قہقہہ لگایا۔

راحتی کو غصہ آ گیا۔اسنے اپنی بیٹی کو زور سے پکڑ لیا۔وردی والے نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اتنی زور سے کھینچا کہ وہ اس کے پاس پہونچ گئی۔

اسکے بعد اس نے دوسرے ساتھیوں کو کچھ اشارہ کیا کہ دو وردی والے راحتی کے پاس آئے اور دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے لے گئے۔راحتی ہاتھ پاؤں مارنے لگی اور چلانے لگی۔

''چھوڑ دو میری بیٹی کو۔۔۔ظالمو۔خبردار میری بیٹی کو ہاتھ بھی لگایا۔۔۔یہ تو تمہاری اپنی بیٹی جیسی ہے۔۔۔

سکینہ ان کو ہاتھ مت لگانے دینا۔۔ان کا منہ نوچ لو۔۔۔۔۔ان کو دانتوں سے کاٹ لو۔۔مگر ہاتھ مت لگانے دینا۔ ۔۔۔کمینو۔۔۔میری بیٹی کو چھوڑ دو ۔۔ ۔۔ سکینہ۔۔۔میری بیٹی۔۔۔'' راحتی زور زور سے رو رہی ہے مگر اس کی آواز بھی کوئی نہیں سنتا ہے۔

پھر اس نے تھوڑی نرمی سے کام لیا اور کہنے لگی۔

''دیکھو بھائیو، مجھ پر مہربانی کرو میری بیٹی کو چھوڑ دو۔۔۔تم جو کہو گے میں کرنے کو تیار ہوں۔۔مگر میری بیٹی۔۔۔اس پر رحم کھاؤ۔۔۔چھوڑ دو اسکو۔۔۔۔''

راحتی کی باتوں کا اثر جب ان پر نہ ہوا تو وہ چلانے لگی مگر وہ اس کو گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔'' محلے والو کوئی ہے کہیں۔میری بیٹی کو بچاؤ۔۔۔۔کوئی ہے۔۔۔کوئی ہے۔۔۔میری بیٹی۔۔۔۔''فوجی نے اس کے سر پر بندوق کے بٹھے سے اتنی زور سے مارا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

☆☆

''راحتی ۔۔راحتی۔۔۔راحتی ہوش میں آجاؤ۔'' عبداللہ اس کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ہوش میں آو۔۔۔۔۔گھر کی چیزیں بکھری کیوں پڑی ہیں۔۔۔اٹھو ہوش میں آجاؤ۔۔۔سکینہ کہاں ہے؟۔

سکینہ کا نام سنتے ہی راحتی ایک جھٹکے میں اٹھ بیٹھی۔اور دوڑنے لگی۔

''سکینہ کہاں ہے؟ کیا گھر میں نہیں ہے۔۔۔۔سکینہ سکینہ۔۔۔سکینہ۔۔۔۔سکینہ'' راحتی چلاتے ہوئے دوسرے کمرے میں دوڑی جہاں سے اسکو باہر نکالا گیا تھا۔سکینہ۔۔۔

سکینہ۔۔۔سکینہ۔۔۔مگر سکینہ کا کہیں پتہ نہیں تھا۔سب جگہ ڈھونڈا کہیں نہیں ملی۔

دوسرے دن صبح سکینہ کی لاش، سڑک کے دوسرے کنارے پڑی ہوئی تھی۔اور اس کا جسم جگہ جگہ لہولہان ہوگیا تھا۔سورج اُگنے سے پہلے ہی ڈوب چکا تھا۔

☆☆☆

(۱۹) سزا۔۔۔۔۔بن جرم

شام کے سائے بڑھنے لگے اور ماں کی بے قراری بڑھ رہی تھی۔کوئی بھی گھر نہیں آ رہا تھا۔ماں کبھی اندر اور کبھی باہر جا رہی تھی۔اور اپنی بے قراری پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔اتنے میں اکمل دروازے سے اندر آیا اور آتے ہی ماں سے چلا کر کہنے لگا۔

''اماں اجمل کہیں نہیں ملتا۔تم تو کہہ رہی تھی کہ گوشت لینے گیا ہے۔''

اسکے بعد دوبارہ بولا۔''ماں کتنے بجے گھر سے نکلا تھا۔؟''

''جب تم سب لوگ دفتر گئے تھے میں نے اس کو گوشت لانے کے لئے بھیجا۔آج اس کو کالج میں چھٹی تھی۔اسی لئے وہ گھر میں تھا۔جمعہ کا ظہر پڑھ کر آیا تو میں نے اس کو بازار بھیج دیا۔اب تو شام کے سات بھی بج گئے ابھی تک لوٹا نہیں۔کہاں گیا ہوگا؟''

اماں کی آنکھیں نم تھیں مگر اس کے باوجود وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسنے اکمل سے دوبارہ اصرار کیا۔

''اکمو ذرا میری جان۔ دوبارہ دیکھو۔ وہ کہاں گیا ہوگا۔ اس کا فون بھی تو بند ہے۔ قصاب کے پاس جاؤ۔ ادھر ادھر ڈھونڈو۔ لوگوں سے پوچھو وہ کہاں ہے۔ کسی نے تو دیکھا ہوگا۔''

''جی اماں'' کہہ کر اکمل تو چلا گیا مگر اس کے دل میں طرح طرح کے برے خیالات آ رہے تھے۔

کہاں جا سکتا ہے؟ کہیں گولی۔۔۔؟ نہیں نہیں خدا نہ کرے۔۔۔ کہیں وہ کسی چیز میں involue تو نہیں۔۔۔ نہیں نہیں۔۔ وہ بچارہ تو بڑا اپڑھا کو بچہ ہے۔۔۔ اسے تو کسی سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔۔۔ اس بچارے نے تو دوست بھی نہیں بنائے ہیں۔۔۔؟ پھر کہاں جا سکتا ہے۔۔۔'' یہ سوچتے سوچتے اکمل اسی محلے مین پہونچا جہاں قصاب سے وہ گوشت لاتے تھے۔ وہ قصاب کی دکان پر پہونچا تو اس نے قصاب سے پوچھا۔

''بھائی اسلام وعلیکم۔۔ کیا آپ نے میرے بھائی کو دیکھا۔۔؟ پہچانتے ہونا اُسے۔۔۔؟ وہ گوشت لینے آیا تھا۔۔۔ تب سے گھر نہیں آیا۔۔'' اس نے ایک ہی سانس میں یہ سب کہہ دیا۔

''ہاں ہاں پہچانتا ہوں۔۔ اس نے تو گوشت بھی لیا تھا۔ اور مجھ سے تو کہہ رہا تھا کہ سینے کا گوشت رکھنا، کیونکہ آج اسے یخنی کھانے کا من تھا۔ قصاب نے شاد ہو کر کہا۔ مگر ساتھ ہی کسی سوچ میں پڑا اور کہنے لگا۔ ''کیوں اجمل صاحب کیا بات ہے۔''

''وہ ابھی تک گھر نہیں لوٹا۔'' دکھ سے بھرے لہجے میں اکمل نے جواب دیا۔

''اوہ خدایا۔۔۔''

''کیا ہوا۔۔۔''

''خدا کرے ایسا نہ ہو۔۔۔آپ کا بھائی تو بے قصور ہے۔''

''کیا ہوا جلدی بولئے۔۔۔میرا دل بیٹھا جارہا ہے۔۔''

''اکمل صاحب۔۔آج دن کو یہاں سے آرمی کی پارٹیاں گشت کررہی تھیں۔کوئی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ انہوں نے بون محلّہ (نیچے والا محلّہ) سے کچھ جوانوں کو دھرلیا ہے۔جن کی نشاندہی ہوئی ہے۔جنہوں نے گشتی پارٹی پر گولیاں برسائیں تھیں۔

اکمل سنتے ہی پاگل جیسا ہوگیا۔''اگر وہ ان کے ہتھے چڑ گیا تو نکلنا مشکل ہے۔''

اجمل اس کا چھوٹا بھائی تھا۔اسکے گھر میں ماں کے علاوہ اجمل ہی تو تھا۔اور اسکی بیوی اور دو بیٹیاں تھیں۔باپ تو پہلے ہی اللہ کو پیارا ہوگیا تھا۔ماں نے ہی ان دونوں کو پال پوس کر بڑا کیا تھا۔اکمل بڑا تھا اسکی شادی کردی اور چھوٹا ابھی بی اے فائنل میں پڑھ رہا تھا۔اکمل اب سوچ رہا تھا کہ پڑھ لکھ کر کچھ بننے کے بعد اسکی بھی شادی کردیں گے۔اور اپنی خوشحال زندگی جی لیں گے۔۔

وہ اب گھر کیسے جائے گا؟ ماں کو کیا جواب دے گا۔وہ تو دیوانہ ہوا جارہا تھا اور بوجھل قدموں سے گھر کی طرف آرہا تھا۔ابھی گھر والی گلی میں پہونچا بھی نہ تھا کہ اس کو راستے میں ہی ماں مل گئی جو بیچ بازار ہی اپنے بیٹے کا انتظار کررہی تھی۔۔۔اکمل کو دیکھتے ہی رو پڑی۔

''میرا اُجو نہیں آیا۔۔۔کہاں گیا میرا اُجو۔۔۔''سینہ پیٹتے ہوئے وہ رونے لگی۔

''کیا نہیں ملا۔۔۔اجو۔۔۔اجو۔۔کہاں گئے میرے بیٹے۔۔۔کیوں روٹھ گئے اپنی ماں سے۔۔۔تمہیں تو ابھی ایم اے کرنا ہے۔۔پی ایچ ڈی کرنا ہے۔۔۔اجو تمہیں کس بلا نے

کھالیا۔۔۔تم کہاں گئے اجو۔۔کہاں ہوتم اجو۔۔۔"

سارے محلے والے جمع ہو گئے اوران ماں بیٹوں کودلاسہ دیتے ہوئے گھرلے گئے۔

گھر میں بچے بھی رونے لگے اور چاچو چاچو کرنے لگے۔ محلے والوں نے اکمل کودلاسہ دلایا اور دو چار لوگ اٹھے اوراسکے ساتھ پولیس سٹیشن چلے گئے۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔

رات بھر گھر ماتم کدہ بنا رہا۔ جوان بیٹا گھر سے غائب ہے۔مگر پولیس سٹیشن میں بھی کچھ خاص معلوم نہیں ہوسکا۔ کہیں کسی طرف سے بھی کچھ معلوم نہیں ہوسکا کہ اگر فورسز لے گئی تو لے گئی کہاں۔ کچھ خبر نہیں ملتی۔

دوسرے دن معلوم ہوا کہ صرف اجمل ہی نہیں بلکہ محلے سے اور بھی دو چار نو جوان گُم ہیں۔ کسی کا بھی کچھ سراغ نہیں ملتا ہے۔ ماں تو رو رو کرنڈھال ہو رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اسکی آنکھوں کی روشنی چلی گئی۔ اور اکمل تو ٹوٹ ہی گیا۔کونسی جگہ جہاں اسکو ڈھونڈا نہیں۔ ہر پولیس سٹیشن، ہر تھانہ میں، ہر جگہ۔ پر اس کی خبر تک نہیں ملی۔

تقریباً دس دنوں کے بعد ایکدن شہر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ کسی میدان میں کچھ لاشوں کو دفنایا گیا ہے۔ یہ خبر اجمل کی ماں کے پاس بھی پہونچ گئی۔ اس نے محلے والوں کو اکھٹا کیا اور کہا

''ہم اپنے بیٹے کو ڈھونڈ نکالیں گے۔ ہو نہ ہو ان کمینوں نے میرے بیٹے کو زندہ ہی دفن کیا ہوگا۔۔۔ بے قصور کو بِنا کسی جرم کے سزا دی ہوگی۔۔۔میرے بھائیو اگر آپ میرا ساتھ دو گے تو چلو اس میدان کی قبریں کھودیں گے۔ اور میں اپنے بیٹے کو واپس نکالوں گی۔۔۔"

ماں رو رو کر چلا رہی تھی۔ سارے محلے والے اکھٹا ہو گئے تھے۔ اور اس میدان کی طرف جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ ماں بھی ان کے ساتھ ہو لی۔ مگر اکمل نے ماں کو

روک دیا کہ اگر مل گیا تو اسے یہاں ہی لائیں گے۔اور اپنی بیوی سے ماں کا خیال رکھنے کو کہا۔

ہر طرف اندھیرا اپنا آنچل پھیلا رہا تھا۔

دو گھنٹوں کے بعد اکمل اپنے محلے کے ساتھیوں کے ساتھ ایک لاش کاندھے پر اٹھائے ہوئے اپنے گھر کی طرف آرہا تھا جو خود بھی ایک لاش بن چکا تھا۔

☆☆☆

(۲۰) مہمان

سیڑھیوں سے کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی تو وہ جلدی جلدی اٹھ بیٹھی۔ اور کھانے کا دستر خوان بچھا دیا۔ شاید اس کے لئے کھانا آ گیا۔ قدموں کی آواز اور تیز ہو گئی تو وہ دروازے کے قریب پہونچی۔ کہ جونہی دستک ہو گی وہ دروازہ کھولے گی۔ وہ بہت دیر تک دروازے کے پاس رُکی رہی۔ مگر جب کوئی دستک نہ ہوئی تب وہ وپس آ گئی۔

سیڑھیوں سے قدموں کی آہٹ آہستہ آہستہ دور ہوتی گئی۔ اور اس نے دستر خوان پھر سے اٹھا دیا۔ ایسا تیسری بار ہوا تھا۔ کہ اس نے دستر خوان بچھا دیا تھا۔

چار دنوں کے سفر کے بعد صبا اپنے چند مرد ساتھیوں کے ساتھ ڈائریکٹر صاحب کے گھر پہونچی تھی۔ ڈائریکٹر صاحب نے بھی صبا کے لئے کمرے کا خاص انتظام کروایا

تھا۔اور صبا۔۔۔چار دنوں کی تھکی ہاری کمرے میں پہونچتے ہی بستر پر پڑی رہی۔

ان کے گھر میں آج چہل پہل دیکھ کر وہ بہت اچھا محسوس کر رہی تھی۔وہ ایک مہینہ پہلے گھر سے روانہ چکی تھی اور کسی کام کے سلسلے میں ملک سے باہر گئی ہوئی تھی۔

وہ جس کمرے میں ٹھہری تھی۔اس کمرے کے نچلے طبقے میں آشپز خانہ تھا۔اس نے دیکھا تھا کہ سارا دن وہ لوگ بڑے بڑے پتیلوں میں کھانا بنا رہے تھے۔وہ اس کو بڑا کھانا کہتے تھے۔کچھ لوگ مٹھائی بنا رہے تھے اور کچھ لوگ چاول۔کچھ لوگ مرغا بنا رہے تھے تو کچھ گوشت کے کباب بناتے تھے۔صبا کے منہ میں یہ سب دیکھ دیکھ پانی آ رہا تھا۔

یکا یک اس کو محسوس ہوا کہ ڈائریکٹر اور اس کے لوگ اس کو بھول گئے ہیں۔کسی نے نہ تو اس کو کھانے پر بلایا اور نہ کھانا ہی کمرے میں بھیج دیا۔رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔

''کیوں نہ میں ایک چکر باہر کا کاٹ کر آؤں۔''اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

اور یہ سوچ کر ہی وہ اپنے کمرے سے باہر نکلی۔وہ ٹہلنے کا بہانہ کر کے نیچے لان میں آگئی۔

گھر کے بڑے سے باغ میں گاڑیوں کی لائینیں کھڑی تھیں۔اور پورا باغ بچوں کے شور و غل سے چہک رہا تھا۔ایسے لگ رہا تھا کہ لوگوں کا ایک بڑا ہجوم ان کے گھر پر آیا ہے۔

ڈائریکٹر صاحب بھی باغ کی گردش کر رہے تھے۔جونہی ان کی نظر صبا پر پڑی۔انہوں نے جھٹ سے پوچھ لیا۔

''خانم، شام کا کھانا کھالیا؟''

''جی کھالیں گے کوئی بات نہیں''۔

''ابھی نہیں کھایا؟''

صبا مسکرائی۔مگر جواب نہ دیا۔دل میں بولا۔''کھانا آئے گا تبھی تو کھاؤں گی۔''

''خانم -آپ اپنے کمرے میں جایئے۔ہم کھانا بجھواتے ہیں۔''صبا اپنے کمرے میں چلی گئی۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔اور کھانے کے برتنوں کی آواز رات کے آٹھ بجے سے ہی آرہی تھی۔بھوک نے اس کے پیٹ میں دھنگل مچانا تو کب سے شروع کیا تھا۔اور کھانے کی خوشبو بھی بڑی زوروں سے آرہی تھی۔اچانک ''ٹن،ٹِن ٹنا ٹنا ۔۔۔۔۔۔ٹن ٹن' برتنوں کی آوازیں اتنی زور سے آگئی ایسا لگا کہ ایک ساتھ کئی پلیٹیں گر گئیں۔

☆☆

اب تو کمرے میں گئے ہوئے بھی دو گھنٹے ہو گئے تھے۔اور اب تو رات بھی ہو چلی تھی۔مگر کھانا نہیں آیا۔

ماہ رمضان کا بارہواں روزہ تھا۔اور پچھلے چار دنوں سے صبا نے روزہ بھی نہیں رکھا تھا۔ایک طرف سے سفر اور دوسری طرف سے تھکان۔آج اس نے سوچا تھا کہ ڈائریکٹر صاحب کے ہاں بڑا کھانا ہوگا تو اسی میں سے بچا کر سحری کا کام بھی نکال دوں گی۔اور روزہ رکھ لوں گی۔۔۔۔

آہستہ آہستہ برتنوں کی آواز آنا بھی بند ہوگئی۔اور لوگوں کی آوازیں بھی۔ایسا لگ رہا تھا کہ لوگ کھانا کھا چکنے کے بعد اپنے اپنے گھروں کی طرف چل پڑے تھے۔اور شاید روزوں کی وجہ سے افطاری کے بعد ہی سب کھانا کھا چکے۔اسکے دوسرے ساتھی بھی شاید کھا چکنے کے بعد سو چکے تھے۔کیونکہ ان کو بھی صبا کا خیال نہیں آیا تھا۔

آسمان پر یکا یک بادل آئے۔اور آپس میں ٹکرانے لگے۔دن بھر کی کڑی دھوپ کے بعد شاید اب بارش آنے والی تھی۔کمرے کی سارے کھڑکیاں زور زور سے بجنے لگیں۔صبا کی آنکھوں سے نیند کہیں دور چلی گئی تھی۔وہ دل کے اندر ڈائریکٹر صاحب کے کھانے کا انتظار کر رہی تھی۔وہ جانتی تھی کہ۔۔۔۔

صبا نے کمرے کی لٹکتی گھڑی کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور زیر لب مسکرائی۔

''خانم صبا۔۔۔۔۔تو تو کل کا روزہ رکھ رہی تھی۔بہتر آج سے ہی روزہ رکھ لے''۔

☆☆☆

(۲۱) خوف

دروازے کی گھنٹی ابھی بجی بھی نہیں تھی کہ دروازہ اندر سے کھل گیا۔

''اسلام وعلیکم۔۔جی میں ہوں۔۔۔''

''جی ،معلوم ہے۔آپ نرگس صاحبہ ہیں۔۔۔سر جی آپ کا ہی انتظار کر رہے ہیں۔''

''شکریہ۔۔۔''نرگس اندر داخل ہو گئی اور داخل ہوتے ہی مہمان خانے میں پہونچ گئی۔اور سر جی صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔نرگس کو دیکھتے ہی کہا۔

''آو نرگس میں تمہارا ہی منتظر تھا۔''

''جی سر۔اسلام وعلیکم''

کیسی ہو نرگس؟ آو بیٹھو''

نرگس دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی اور سر جی نے اپنے سر اور ہاتھ سے قریب والے صوفے پر

بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

نرگس کے پورے بدن میں سنسنی چھا گئی۔ ''کیوں بلایا انہوں نے مجھے اپنے قریب''

''جی میں ٹھیک ہوں''

''نرگس میرے پاس آؤ تاکہ میں تمہارے ساتھ بیٹھ کر صحیح طریقے سے تمہاری رہنمائی کرسکوں۔''

سر جی نرگس کے طالب علمی کے زمانے کے استاد تھے۔ اور آج ایک بار پھر نرگس کو ان سے گائڈنس کے سلسلے میں کام آ گیا تھا۔ نرگس نے ان کے ساتھ فون پر ہی بات کی تھی۔ تو انہوں نے گھر آنے کے لئے کہا۔ گھر کے دوسرے افراد کے بارے میں پوچھا تھا تو سر نے بتا دیا تھا کہ انکی بیگم صاحبہ بھی گھر میں ہی رہتی ہیں۔ وہ دونوں میاں بیوی اب ریٹائر ہو چکے تھے۔ نرگس نے چین کی سانس لی۔

مہمان خانے میں بیٹھتے ہی اس نے ادھر ادھر دیکھا مگر کسی کی آہٹ تک سنائی نہ دی۔ وہ سر جی سے پوچھنے ہی والی تھی کہ میڈم خود ہی سامنے آ گئی۔ نرگس نے اپنی سانسوں میں ہلکا پن محسوس کیا۔ وہ سر جی کے ساتھ کھل کھلا کر ہنسنے لگی۔ اور اپنے کام کی بات کرنے لگی۔

مگر میڈم۔۔۔۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس اپنے روم میں چلی گئی اور نرگس کے چہرے پر آہستہ آہستہ خوف و ہراس پھیلنے لگا۔ اسکے پورے بدن میں جیسے سردی کی لہر دوڑ گئی اور اندر ہی اندر سے کانپنے لگ گئی۔

حالانکہ سر جی نے ایسی کوئی بھی بات نہیں کی تھی۔ اور نہ ہی اس قسم کی کوئی حرکت کی تھی جس کی وجہ سے وہ ڈر محسوس کر رہی تھی۔ مگر ایک انجانا سا خوف اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو کوس رہی تھی کہ کیوں وہ اکیلی چلی آئی۔ وہ سر جی کی

طرف بیخوف ہو کر دیکھ بھی نہیں پا رہی تھی۔ بلکہ اسکے ساتھ نظر بھی نہیں ملا رہی تھی۔

اس کو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ خوف اور ڈر کے نیچے دبی جا رہی تھی، جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو سکوڑ رہی تھی۔ وہ ڈر اور خوف کہاں سے آیا تھا وہ سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی ۔۔۔ اسکے لرزتے بدن میں حرارت کی ضرورت تھی ۔ پورا بدن سرد ہو چکا تھا اور اسکے ہونٹوں پر سے مسکراہٹ جیسے گم ہو چکی تھی۔

اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کوئی چوری کر رہی ہے اور۔۔۔۔

''دیکھو بیٹی! میری طرف دیکھو اور غور کرو۔۔۔۔'' سر جی نے بات شروع کی۔

''بیٹی۔۔۔۔''؟

''اوہ خدایا، میں تو۔۔۔ایک خوشی کی بجلی اس کے پورے بدن میں کوند گئی۔اور سارے جسم میں حرارت بھر گئی۔''

نرگس کا سارا خوف ایک دم سے زائل ہو گیا اور اسنے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

☆☆☆

(۲۲) گن مین(Gun man)

ہسپتال میں اوٹ ڈور میں لائن میں لگی لڑکیاں اورعورتیں ایک ایک کر کے لیڈی ڈاکٹروں کے پاس آتی رہیں۔ڈاکٹر صاحبہ پوچھ رہیں تھیں۔

''ہاں جی۔آپ کا نام۔۔شوہر کا نام۔۔شادی کب ہوئی۔۔کونسا مہینہ ہے۔۔۔وٹامن لیتی ہو۔۔انجکشن لئے۔۔۔گوشت کھاتی ہو۔۔۔سبزی کھاتی ہو۔۔۔'' وغیرہ وغیرہ

ایک ایک مریضہ اپنا ملاحظہ کروا کے نکل جاتی۔اپنا نسخہ اٹھاتی ۔ دوائی لے لیتی ،اور چل پڑتی۔

قطار کے بیچ میں ایک چھوٹی سی تیرہ چودہ سال کی لڑکی اپنے بغل میں کچھ چھپائے دانتوں میں انگلی دبائے ،آگے آگے آرہی تھی۔کبھی منہ چھپاتی اور کبھی منہ کی الگ الگ شکلیں

بنا رہی تھی۔

''ہاں جی۔۔آپ کا نام۔۔۔

''صبرینا۔۔۔

''شوہر کا نام۔۔۔

''پتہ نہیں۔۔۔''

''شادی کب ہوئی''؟

''پتہ نہیں۔۔۔''

''اچھا پھر یہ کیا ہے۔''ڈاکٹر نے اسکے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''ہینی ۔۔۔ہینی ۔۔۔''دانتوں میں انگلی رکھ کے، منہ کو دوسری طرف کرلیا۔

''یہ۔ہہنی ہین کیا کرتی ہو۔۔۔پیٹ میں بچہ ہے۔۔۔؟''

''ہاں۔۔''

''کونسا مہینہ ہے۔۔۔۔''

''ٹائیم ہے۔۔۔''

''ٹائیم ہے۔۔۔بے وقوف۔۔''۔ڈاکٹر کو قدرے غصہ آیا۔اسنے دانتوں کے ساتھ دانت ٹکرائے۔

''کیسے کیسے لوگ آتے ہیں علاج کرنے۔۔۔سرکاری ہسپتال ہے نا۔۔''

ڈاکٹر ناظمہ نے ڈاکٹر نائلہ کی طرف دیکھ کر کہا۔''ڈاکٹر صاحب دیکھا آپ نے یہاں سے کیسا پیشنٹ آیا۔اسکو اشاروں میں اور دانت دبائے ساری کہانی بیان کردی۔

ڈاکٹر نائلہ حیرانگی سے اسے دیکھنے لگی۔۔۔معاینہ کے بعد اس نے مریضہ سے کہا۔

''دیکھوایسا کرو کہ آج جمعرات ہے۔اگلی جمعرات کوآجاؤ۔اور ہاں اپنے شوہر یا اپنے گھر والوں کوساتھ لے آؤ۔''

''ٹھیک ہے۔؟۔۔'' پھرانگلی کودانتوں میں دبائے چلی گئی۔اورڈاکٹر صاحبان ہونٹوں تلے ہی مسکرانے لگے اور دوسرے اوٹ ڈورمریضوں کودیکھنے میں مشغول ہوگیئں۔مگراس نے ان دونوں ڈاکٹروں پرایک عجیب سی چھاپ ڈالدی۔

ڈاکٹر نائلہ پراسکااثر کچھ زیادہ ہی گہرا ہوا۔وہ سوچ رہی تھی کہ یہ لڑکی تواپنے دماغی توازن کھوچکی ہے شاید۔کیا کرے گی ماں بن کے؟۔کیسے پالے گی بچے کو؟ کیسے رکھے گی خیال اس کا؟ایک عجیب سی الجھن اسکے دماغ میں تھی۔اگراس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہے تو پھراسکی شادی کیسے ہوئی؟اور یہ بچہ؟۔۔۔۔

کیسے کیسے سوالات اس کے ذہن میں آرہے تھے۔اوروہ سوچ رہی تھی۔۔۔

جمعرات سے جمعرات آئی اورآج پھرانہی ڈاکٹروں کااوٹ ڈورتھا۔خواتین کی قطار میں پھریہ لڑکی اپنے بغل میں کچھ چھپائے آرہی تھی۔ڈاکٹروں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔انہیں اسے بہت سے سوال کرنے تھے۔مگر جب معائینہ کیا تو سچ مچ اسکا ٹائم آگیا تھا۔

''تم نے شوہرکوساتھ لایا۔''

''نہیں''

''پھرکس کولایا؟ماں کو۔بہن کو۔۔۔''

''تمہیں ہسپتال میں ایڈمٹ ہونا ہے۔اچھا کسی کونہیں لایا۔۔۔۔؟''

کیوں؟۔۔کوئی نہیں ہے؟۔۔۔پھر یہ بچہ کس کا ہے؟۔۔۔۔کیا کرتی ہوتم؟۔۔۔کوئی کام

کرتی ہو؟۔۔۔پھر کھاتی کیا ہو۔۔۔۔"

ڈاکٹر صاحبہ نے کتنے ہی سوال ایک ساتھ کئے مگر وہ جواب نہیں دے رہی تھی۔اس سوال پر اس نے اپنے دانتوں سے انگلی باہر نکالی اور کہنے لگی۔

"میں۔۔میں ۔۔گلی کے نکڑ پر بھیک مانگتی ہوں۔اس بڑے سے محل کے پیچھے ہم بہت سارے لوگ خیموں میں رہتے ہیں۔"

"بھیک ؟"حیرانگی سے

"یہ تمہارے بغل میں کیا ہے'؟'

"کُرتا"

"کُرتا"؟کس لئے ؟

بچے کے لئے۔

یہ بچہ۔۔۔۔؟؟کس کا بچہ ہے یہ؟۔۔۔۔

"اُس کا۔۔ڈاکٹر صاحب وہ۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔آتا تھا نا۔۔وہ داڑھی والا۔۔لمبے بالوں والا۔

"کون آتا تھا۔۔نام نہیں ہے اسکا؟ کیا نام ہے اسکا؟

"اس کا نام ہے گن مین۔اسی نام سے سب اسکو جانتے ہیں۔"

☆☆☆

(۲۳)جگر

جے پور پہونچتے ہی ہم نے گاڑی ایک ریسٹورانٹ کے سامنے روکی اور اندر داخل ہوئے۔اور میرے ساتھ میرے اور بھی دوست تھے۔ہم نے ایک چھ کرسیوں والا ٹیبل خالی دیکھا اور جھٹ سے بیٹھ گئے۔ابھی بیٹھے بھی نہ تھے کہ ایک لڑکا ہاتھ میں ڈسٹر لئے آیا اور ٹیبل صاف کرنے لگا۔ٹیبل پر ابھی ہم سے پہلے کھانیوالوں کی جھوٹی پلیٹیں اور گلاس پڑے تھے۔

تھوڑی ہڈیاں تھوڑے چاول اور جھوٹا پانی۔۔۔اور وہ صاف کرتا گیا۔ٹیبل صاف کیا،گلاس بدل دئے اور پینے کا صاف پانی لایا۔اور ساتھ میں مینو کارڈ بھی ہاتھ میں لائے۔اور ہم سب کے ہاتھوں میں ایک ایک کارڈ تھما دیا۔

یہ بچہ کتنا خوبصورت ہے۔''میں نے اسکو دیکھتے ہی کہا۔

''ارے سچ مچ یہ بچہ بہت خوبصورت ہے۔''اسکے ساتھ ہی سب دوستوں نے بھی حامی بھری۔

میں نے اس بچے کا ہاتھ تھاما اور اسکے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔میں نے اسکو اپنے

قریب بلایا۔اور کچھ پوچھنے سے پہلے اس نے ایک زبان میں پوچھ لیا۔

''کیالاؤں صاحب۔۔۔چاول؟نان؟میٹ کری؟چکن کری؟کباب۔۔۔''

''تم چکن کری اور نان لاؤبس۔۔۔ہم سب کو وہی کھلاؤبس۔۔۔بہت بھوک لگی ہے۔''

بچہ گیا اور دو منٹ کے بعد واپس آیا۔اور ایک پلیٹ ہمارے سامنے رکھی ۔جسمیں گاجریں،مولی کے قتلے،مولی کے سبز پتے،اور لیموں کے کچھ ٹکڑوں کے علاوہ تھوڑی پیاز بھی تھی ۔جس کو گول گول کاٹا گیا تھا۔میں نے لیمو کا ٹکڑا اٹھایا اور اس کا رس نچوڑ کر سلاد میں ڈالدیا۔اور مولی کے قتلے سب کھانے لگے۔

میں نے دوبارہ اس چھوٹے لڑکے کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے قریب کھینچا۔

''کیا نام ہے تمہارا۔۔''

''جِگر''

''جگر۔۔تم تو سچ مچ جگر جیسے ہی ہو۔۔۔''

''ماں نے یہ نام دیا کیا؟۔۔''

''معلوم نہیں''کہہ کر پھرتی سے چلا گیا

''ماں تو ہر بچے کا نام جگر رکھتی ہے۔''میں نے دبے ہونٹوں میں کہا۔

کئی سوال میرے دل کو کرید رہے تھے۔اور میں چاہتی تھی کہ میں اس ننھے بچے کو گود میں اٹھا کر کئی سوال پوچھوں۔مگر اسکی پھرتی،اور خریداروں کا اژدھام،کہ وہ ایک جگہ ٹکتا ہی نہ تھا۔میں نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی دیکھا کہ اس ریسٹورانٹ میں بہت

سارے بچے کام کرتے تھے۔سب نے سفید کرتا اور شلوار پہن رکھی تھی۔کوئی بچہ ٹیبل صاف کرر ہا تھا،کوئی جھوٹے برتن اٹھاتا،کوئی پانی لاتا،کوئی سلاد کے قتلے کاٹتا،کوئی برتن مانجھتا اور کوئی روٹیاں اور نان بناتا تھا۔

مجھے ان بچوں کے گھر والوں پر بڑا غصہ آرہا تھا۔کیسے ماں باپ ہیں ان کے۔جو ان کو سکول بھیجنے کے بجائے رستورانوں میں کام کرنے بھیجتے ہیں۔ایسی بھی کیا مجبوری۔؟

آخر کار میں نے اس بچے کو پکڑ ہی لیا اور اپنے قریب بٹھا ہی لیا۔اس نے ہاتھ چھڑانے کی بڑی کوشش کی۔''صاحب،مالک دیکھے گا تو کھال کھینچ لے گا۔''

وہ ہم سب کو صاحب ہی کہہ رہا تھا۔مگر میں نے بھی اس کا ہاتھ نہ چھوڑا،اور کہا۔

''پہلے میرے سوالوں کا جواب دے دو۔''سکول نہیں جاتے ہو؟پڑھائی لکھائی نہیں کرتے۔''

نہیں صاحب۔۔پہلے پڑھتا تھا۔۔تیسری جماعت تک پڑھتا تھا۔۔۔پھر پڑھائی چھوڑ دی۔''

''کیوں چھوڑ دی۔۔۔چلو میرے ساتھ کشمیر۔۔میں تمہیں وہاں سکول بھیجوں گی۔''

''نہیں صاحب۔۔کیسے جاؤں گا۔۔کشمیر تو یہاں سے بہت دور ہے۔۔

''بہت دور تو ہے مگر۔۔۔میں تمہیں اپنے ساتھ وہاں لے جاؤں گی۔تمہارے ماں باپ تمہیں سکول نہیں بھیجتے ہیں نا۔میں بھیج دوں گی۔

''سکول جاؤں گا تو کماؤں گا کیسے۔۔۔باپ تو نہیں ہے۔۔اگر میں کام

نہیں کروں گا تو ہم کھائیں گے کیا؟ ۔۔میری ماں اور چار بہن بھائی اور ہیں ۔۔
وہ آپ دیکھ رہے ہو وہ لڑکا جو نان بنا رہا ہے۔وہ میرا بھائی ہے۔(اس نے ہاتھ کے اشارے سے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کیا)
ہم ہی تو کماتے ہیں اور گذارہ ہوتا ہے۔اگر ہمارا ماما بھی ہم پر ترس نہیں کھاتا ہم تو بھوکوں مر ہی جاتے۔

''ماما کہاں ہے''؟

''وہی ہے نا اس ریستورانٹ کا مالک۔۔''

''کتنا دیتا ہے''

''دو ہزار روپیہ مہینہ اور دن کا کھانا۔۔اور ہمیں چاہئے بھی کیا۔؟

''صاحب آپ کچھ اور کھائیں گے۔یا بل لاؤں۔۔''۔۔۔۔۔۔

''بل۔۔۔'

''آپ باقی کے پیسے تو لے لیجئے۔۔۔۔

یہ آپ نے ٹپ کے لئے کتنے روپیئے رکھے ہیں۔۔۔۔

ہمیں پانچ سو تو کوئی ٹپ نہیں دیتا۔۔۔۔صاحب۔۔۔صاحب۔۔۔

وہ چلاتا رہا اور ہم سب کے سب گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی تیز رفتاری سے چلی گئی۔

☆☆☆

(۲۴) ہزار کا نوٹ

بڑی مشکلوں سے آخر کار بیٹے کو ایم بی بی ایس میں داخلہ مل ہی گیا۔ ایک تو نمبرات میں بھی کوئی تیر نہیں مارا تھا۔ اور دوسرا ڈاکٹری کا بھی کچھ زیادہ شوق نہیں تھا۔ مگر کچھ سفارش اور کچھ اِدھر کا اُدھر کر کے میڈیکل میں داخلہ کرا ہی دیا۔ کیونکہ منوّر صاحب اور اسکی بیوی دونوں کو بہت شوق تھا کہ ان کا بیٹا ڈاکٹر ہو جائے۔ ورنہ اسکی محنت کا عوض اس کو سیٹ سے مل جائے ایسا نہیں تھا۔

خدا کو بھی شاید یہی منظور تھا۔ سارے گھر میں خوشیوں کی لہر سی دوڑ گئی۔ اور سب کے چہروں پر مسکراہٹ کِھل گئی۔

منوّر صاحب نے اپنی بیوی کے چہرے پر مسرّت دیکھی تو کہا۔

''بہت بہت مبارک ہو آپ کو۔ آپ کے بیٹے کو سیٹ مل گئی۔''

''خیر مبارک جی۔ کیا صرف میرے بیٹے کو سیٹ مل گئی؟''

''ہاں ہاں بھئی سب کو مبارک ہے۔''

''یہ تو ہماری دلّی تمنا تھی جو آج بھر آئی۔ اللہ کا شکر کس طرح سے بجالاؤں اس نے ہماری دعا قبول کی۔''

''جی ہاں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔''

منوّر صاحب تو خود بھی بہت بڑے ڈاکٹر تھے۔ مگر اسکی بیوی ہاوس وائف (house wife) تھی۔ ڈاکٹر صاحب سے زیادہ اسکی بیوی کو یہ آرزو تھی کہ بیٹا بھی ڈاکٹر بن جائے۔

منوّر صاحب سرکاری ہسپتال میں ڈاکٹر تھے۔ مگر وہ ہر صبح کلینک بھی جاتے تھے۔ اور وہاں پر بیماروں کا علاج کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی بیوی کے ساتھ یہ معاہدہ کیا تھا کہ اسکی آمدنی کا وہ حصہ جو کلینک سے ملتی ہے وہ صرف اور صرف اسکی بیوی کے لئے ہے۔ اور اس پر صرف اسی کا حق ہے۔

اسکی بیوی بھی بہت ہی سگھڑ اور دانا تھی۔ وہ اس پیسے کو خرچ بھی کرتی تھی اور بچا بچا کر بھی رکھتی تھی۔ یہ سوچ کر کہ داشت آید بکار۔ اس کے بچوں کو بھی اس معاہدہ کی خبر تھی۔ اس لئے وہ بھی آئے دن اپنی ماں سے پیسے اینٹھتے تھے۔ اور وہ بھی ایک عام ماں کی طرح دیتی رہتی تھی۔

جب سے سمیر کو سیٹ نکلی، میڈیکل کالج جانے کے لئے اس نے اپنے پاپا سے اجازت لی تھی کہ گھر میں دوسری گاڑی جو پڑی ہوئی تھی وہ کالج لے جائے۔ اسکے پاپا نے بھی اسکی اجازت دے دی تھی۔

مگراب سوال تھااس کے روز روز کے پیٹرول کا۔اسکو ہفتے میں ایک بار تو پیٹرول ڈالنا ہی تھا۔اوراس کے لئے اس نے ماں کا سہارا لیا۔

ماں کے گلے میں دونوں ہاتھ ڈال کے اسکی پیشانی چومتا،اسکے ہاتھوں کو اپنے گالوں پر رکھتا،اسکے ہاتھوں کو چومتا،اور پھر بہت ہی پیار کے ساتھ ماں کی طرف دیکھتا۔۔۔

''بول کیا بات ہے۔اتنی محبت کیوں اُمڈ آئی ہے کیا پیسے ختم ہو گئے؟''

''ہوں۔۔میری اچھی ماں۔۔۔تمہیں تو سب پتہ چلتا ہے۔۔''

''چلو چلو۔۔اب زیادہ مکھن مت لگاؤ۔۔ٹھہرو میں دیتی ہوں۔''

''ماں بھی گئی اور ایک ہزار روپے کا نوٹ ہر بار کی طرح لے آئی۔

''میری پیاری ماں۔۔میری اچھی ماں۔۔I love you ma''

''چل چل اب'' ماں بھی دل ہی دل میں بیٹے کی بلائیں لیتی ہے۔

''دیکھنا ماں۔۔جب میں ڈاکٹر بنوں گا۔۔میں روز تمہیں ایک ہزار روپیہ دیا کروں گا۔۔۔دیکھنا تم۔۔۔''

''خدا میری آنکھوں کو وہ دن دیکھنا نصیب کرے۔جب تو کمائے۔

دن گذرتے گئے۔۔ہفتے۔۔۔مہینے ۔۔اور پھر سال بیت گئے۔۔اور بیٹا ڈاکٹری کا ایک ایک سال پڑھتا گیا۔۔اور ایک ایک امتحان پاس کرتا گیا اور یہ سلسلہ جاری رہا۔اور آخر کار ایک دن ایسا بھی آیا جب بیٹا سچ مچ کا ڈاکٹر بن ہی گیا۔

اب بیٹا تنخواہ لانے لگا۔مگر اس کو اپنی کہی ہوئی بات بھول گئی تھی۔ ماں کو وہ بات آج بھی اسی طرح یاد تھی۔وہ اسکے وعدے کا انتظار تو نہیں کر رہی تھی۔مگر اپنے

بیٹے کو شاید آزمانا چاہتی تھی۔ وہ سمیر کے پاس آئی اور کہا۔

''بیٹا سمیر، تمہارے پاس اگر ایک ہزار روپئے ہیں تو مجھے ذرا دینا، مجھے کچھ لانا ہے۔''

''جی ماں، میں دیتا ہوں''۔ اسنے کشادہ جبین سے کہا۔

ماں نے بھی ہزار روپئے لئے اور خوشی بٹورتی ہوئی چلی گئی۔

مہینہ بھر گذرنے کے بعد اسنے پھر سے یہی کام دہرایا اور بیٹے نے پھر ہزار کا نوٹ دیا۔۔۔

مگر تیسری دفعہ ماں کا منہ کھولنا ہی کیا تھا کہ بیٹا ماں پر برس پڑا۔

''اب تو تمہیں مانگنے کی عادت پڑ گئی۔ اب تمہیں روز ہزار کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیا اب باپ تمہیں کچھ نہیں دیتا ہے؟ میری بھی ہزار ضرورتیں ہیں۔۔۔ ہر صبح تو آتی ہے، ہزار ہے؟ ہزار ہے؟۔۔۔ آج کل مہنگائی بھی تو کتنی ہے؟ ۔۔۔ ھزار ۔۔۔ ھزار۔۔ یہ کوئی کم رقم تو نہیں ہوتی۔۔ ماں نے اپنی دونوں آنکھیں میچ لیں۔۔''

بیٹے سے کچھ نہیں کہا۔ بوجھل قدموں سے آنکھوں میں آنسو لئے واپس مڑی۔

بیٹا ہزار کا نوٹ لیکر آیا۔۔ مگر ماں جا چکی تھی۔۔۔

☆☆☆

(۲۵) ساتھی

''کیا تم میرے مرنے کے بعد دوسری شادی کرو گے؟''

''ارے نہیں۔ یہ تم کیسی باتیں کرتی ہو۔''

''واقعی''؟

''میری رگوں میں تو تمہاری محبت بسی ہے۔۔۔ یہ اور بات ہے کہ مجھے تیرے جانے کے بعد اپنی تنہائی کا ساتھی ڈھونڈنا ہوگا''۔

☆☆☆

(۲۶) حرف حرف

''کیا کام کرتے ہو''؟

''بس کچھ نہیں۔ لکھے ہوئے حرفوں کو مٹاتا ہوں۔''

''لکھے ہوئے کو مٹانا تمہارا کام نہیں۔۔۔۔ مٹتے ہوئے کو لکھو تو بڑی بات ہے۔''

☆☆☆

(۲۷) خریدار

’’سنیئے، اس تصویر کی قیمت کیا ہے؟‘‘

’’اس کی قیمت بہت زیادہ ہے۔۔۔تم نہیں دے سکتی۔‘‘

’’کیوں۔۔۔میں کیوں نہیں دے سکتی؟‘‘

’’ارے۔۔۔تم اس تصویر کا کیا کروگی۔۔۔تمہارے کس کام کی؟‘‘

’’میں اس تصویر کو خرید کر۔۔۔جلا کر مٹانا چاہتی ہوں۔‘‘

☆☆☆

(۲۸) جہیز

''وہ لڑکی شادی کے لئے بہت اچھی ہے۔اور امیر زادی بھی ہے۔ بہت سارا جہیز بھی لائے گی۔''

''تم سے کس نے کہا''

''اس کا باپ بہت پیسے والا ہے۔اسی لئے تو جہیز لائے گی۔۔۔تم ہی تو چاہتے تھے کہ جہیز لانے والی ہو۔''

''ہاں۔۔میں یہی ڈھونڈتا تھا۔''

''جاؤ۔ان سے شادی کے لئے ہاں کردو۔اور جہیز لینے سے منع کردو۔''

''مگر ایسا کیوں۔۔۔''

''تاکہ انہیں یہ احساس ہو کہ میں نے جہیز نہیں لیا''

☆☆☆

(۲۹) تھیلا

''یہ اتنے پیسے تجھے کہاں سے ملے''؟

''ایک آدمی آیا اور اس نے ایک تھیلا بیچ بازار میں رکھنے کو دیا۔''

''کیا تم نے رکھ دیا''۔

''ہاں۔۔۔اسی کے تو دوسو روپے ملے۔ اب ماں کے لئے دوائی لاسکتا ہوں۔''

''مجھے بھی دکھاؤ۔ وہ تھیلے کہاں سے ملتے ہیں۔ مجھے اپنے بابا کے لئے کھانا لانا ہے۔''

Chinar ke Barfeelay sayay

A Collection Of Short Stories

by

Dr. Neelofar Naaz Nahvi

نام : نیلوفر ناز نحوی قادری

تعلیم : ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

مشغلہ : ایسوشیٹ پروفیسر، ہائر ایجوکیشن

اشاعتیں :

۔ غنی کشمیری حیات اور شاعر	۲۰۰۲ء
۔ فارسی کی طرف پہلا قدم	۲۰۰۶ء
۔ فارسی کی طرف پہلا قدم ۔ جدید ایڈیشن	۲۰۰۸ء
۔ شہرہای نور	۲۰۱۰ء
۔ غنی کشمیری ۔ جدید ایڈیشن	۲۰۱۱ء
۔ فارسی کی طرف دوسرا قدم	۲۰۱۲ء
۔ چنار کے برفیلے سائے (افسانوی مجموعہ)	۲۰۱۳ء

زیر طبع : ۔ یادگار ایران

۔ مضامین

ISBN 978-81-924010-1-0

Cover Design by Haan [illegible] Quadri

Printed by Alhayat Printographers, Gawkadal, Sgr #2473818